سوچ کا سفر

"تو اے شرمندہ ساحل اُچھل کر بے کراں ہو جا"

"یہ ادراک کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے، روح کے کرب اور رتجگوں میں اُبھرتے ہوئے خیالات کو تعمیری اور مثبت سمت موڑتے ہوئے بہاؤ کے سفر کا نام ہے۔ جس کی نمود خونِ جگر سے ہوئی ہے۔"

صاحبزادہ حذیفہ اشرف عاصمی

عاصمی پبلی کیشنز

1۔4 مزنگ روڈ لاہور، پاکستان 0316-0047472

Email: asmipublications@gmail.com

نام: سوچ کا سفر

مصنف: صاحبزادہ حذیفہ اشرف عاصمی

نظرِ ثانی: مرزا صہیب اکرام، صاحبزادہ میاں محمد اکرم،
صاحبزادہ میاں محمد اعظم

اہتمام اشاعت: پیرزادہ میاں محمد عمر عاصمی

سرِ ورق: صداقت صدیقی

ایڈیشن: 2020ء

تعداد: 1000

قیمت: 500/-

عاصمی پبلی کیشنز

4-1 مزنگ روڈ لاہور، پاکستان 0316-0047472

Email: asmipublications@gmail.com

انتساب

انسانیت کو اعلیٰ اخلاقی اقدار قانونی نصاب عطا کرنے والی عظیم ہستی

خاتم النبین حضرت محمد ﷺ کے نام

اور

اپنے والدِ محترم صاحبزادہ میاں محمد اشرف عاصمی ایڈووکیٹ

برادرِ اکبر

پیرزادہ میاں محمد عمر عاصمی

کے نام

جنھوں نے ہمیشہ میری رہنمائی فرمائی

فہرست

تبصرہ جات

حصہ شاعری

مضامین

افسانہ

❑**سولفظی کہانیاں**

تاثرات

نسلِ نو کا ترجمان حذیفہ عاصمی

صاحبزادہ حذیفہ اشرف عاصمی ادبی دنیا میں طلوع ہونے والا ایسا ضوریز ستارہ ہے جو ابھی نمودار ہو رہا ہے اور ماشاءاللہ اسکی روشنی ابھی سے ادبی دنیا کو منور کر رہی ہے حذیفہ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز نثر سے کیا اور ہمیں اسکی ادب سے محبت کی ابتدا اس کی فن تقریر میں نمایاں ہوتی نظر آتی ہے اور اس کے بعد تقریر اور تحریر دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں اسکو نا صرف بولنے کا ہی فن نہیں آتا بلکہ آپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیےفنِ تحریر میں بھی مہارت رکھتا ہے۔

روشن ستارے جس طرح مسافروں کے لئے قطب نما کا کام دیتے ہیں راہبری کے ساتھ ساتھ لوگ قیافہ شناسی کا علم بھی انہی سے سیکھتے ہیں اور زندگی کے راستوں کا تعین کرتے ہیں۔حذیفہ کا" سوچ کا سفر " جو قطبی ستارے کی طرح شروع ہوا اور پھر اس کی ایک کہکشاں سی بنتی گئی اور یہ کہکشاں آسماں پر اپنے ساتھ ساتھ بہت سے اور ستاروں کو ملا کر ادبی دنیا کی نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے اور یہ روشنی اس وجہ سے ہے کہ حذیفہ کی سوچ کے سفر کی منزل یقینِ کامل ہے اور اس منزل تک پہنچنے کے لئے اس نے صراط مستقیم کو چنا ہے مثبت سوچ کو اپنایا ہے زندگی کو اندھیروں سے نکال کر لوگوں کو روشنی کی طرف لانے کی کوشش کر رہا ہے۔منفی سوچ یقیناً تاریکی کی جانب لے جاتی ہے اور یہ تاریکی ظلمتوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتی ہے لیکن مثبت سوچ انسان کو تیرگی سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتی ہے اور ہمارا سفر نا معلوم سے معلوم کی جانب شروع

ہو جاتا ہے اور سوچ کا یہ سفر کبھی اختتام پذیر نہیں ہوتا اور اس سفر میں جب مثبت راستے کو اپنا لیا جائے تو اس میں زندگی کے بہت سے نکات ہمارے سامنے آتے ہیں جو ہماری ہر منفی سوچ کی نفی کرتے چلے جاتے ہیں اور ہمیں خود اعتمادی محبت بھروسہ عطا کرتے ہیں اور ہمیں یقینِ کامل کی منزل کی طرف رواں دواں رکھتے ہیں اور یہ مثبت سوچ ہمیں اللہ پر بھروسے کی وجہ سے ملتی ہے۔

جو لوگ حضرت علامہ اقبالؒ کی تحریروں خصوصاً اُنکی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو یقیناً ایک اُمید کا جذبہ انکے اندر پیدا ہوتا ہے اور ایک شاہین جیسی قوتِ پرواز انہیں ملتی ہے اور جب یہ جذبہ ہمارے نوجوانوں میں بیدار ہو جائے تو وہ اس مقام تک جا پہنچتے ہیں کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

جس طرح سے اقبالؒ کی شاعری دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے انکے قارئین اسی طرح ان سے متاثر ہوتے ہیں اور وہی جذبہ بیداری انکے اندر جنم لیتا ہے اور وہ کسی بھی چیز کو اپنے اس پرواز کے رستے میں حائل نہیں ہونے دیتے کیونکہ بقولِ اقبالؒ کے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

لاہوت وہ مقام ہے جو فنا فی اللہ کے بعد ملتا ہے اور فنا فی اللہ کی منزل یقینِ کامل کے بعد حاصل ہوتی ہے اور مجھے فخر ہے کہ یہ جذبہ نوجوان نسل کے نمائندہ شاعر، ادیب، کالم نگار، اینکر پرسن حذیفہ اشرف عاصمی کی تحریر میں نظر آ رہا ہے اور اب اس نے شاعری کی وادی پرخار میں بھی قدم رکھ دیا ہے اور آبلہ پا تیزی سے اس میں بھی آگے بڑھ رہا ہے اور مجھے اسکے استاد ہونے پر فخر ہے۔

میں نے بھی جب اپنی شاعری کا آغاز کیا تو میرے بھی کلام میں اقبالؒ کی شاعری کا رنگ جھلکتا تھا اور علامہ اقبالؒ کی شاعری نے مجھے بہت کچھ سکھایا اور میرے اندر اُمید کے دیے کو

ہمیشہ جگمگاتا رکھا یہی جذبہ مجھے حذیفہ میں بھی موجزن نظر آتا ہے اور جذبات کا یہ بڑھتا ہوا سیلِ رواں اسکی سوچ کے سفر کے سفینے کو علم وادب کے سمندر میں بہت تیزی سے آگے لے جارہا ہے اور ہماری مستقبل کی بہت سی اُمیدیں ان سے وابستہ ہیں کیونکہ آج ہماری نئی نسل جس دور میں آنکھیں کھول رہی ہے یہ ٹیکنالوجی کا دور ہے اور ہم انسان سے زیادہ ایک مشین بن کر رہ گئے ہیں۔اور ہمارے اندر بہت سے احساسات اور جذبوں کا فقدان پیدا ہو گیا ہے۔ہمارے ہر طرف دہشت گردی کا حصار نظر آتا ہے یہ ایک خوف کا تاثر دیتا ہے اس سے نمٹنا بھی ہمارے نوجوان نسل کی ذمہ داری ہے کیونکہ ان کے اندر قوت، ہمت، اعتماد اور یقین کی کمی نہیں ہوتی اور انکے جذبات میں ارتعاش کے ساتھ ساتھ عمل کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے اور اس کے پیچھے شفیق والدین نستعلیق اساتذہ اور بہترین دوستوں کا ہاتھ ہوتا ہے جو اُن کو پُر اُمید رکھنے کے ساتھ ساتھ بلند پروازی پر بھی مائل رکھتا ہے۔

اور حذیفہ ہمارے سامنے اس کی ایک مثال بن کر کھڑا ہے اور میری نظروں میں اس نوجوان نسل کے نمائندے کا روشن مستقبل ہے اور میں اس کے توسط سے ماں ہونے کے ناطے نئی نسل کو ایک پیغام دینا چاہتی ہوں۔کیونکہ مجھے پوری اُمید ہے کہ آنے والی نئی نسل ہمارے ملک وملت کی تقدیر بدلے گی اور میری ممتا کا جذبہ اور دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

مری ممتا کا جذبہ ہی تجھے اونچا اڑائے گا
وطن کا پاسباں تو ہے زمانے کو بتائے گا
یقیناً تو ہی بیڑے کو تباہی سے بچائے گا
دھنک رنگوں سے اپنی ماں کی چنری کو سجائے گا
اُٹھا کر اپنا پرچم آگے آگے بڑھتا جائے گا
مقدر سوہنی دھرتی کا بھی اک دن تُو جگائے گا
میں ماں ہوں میں تجھے پیچھے کبھی ہٹنے نہیں دوں گی

تو شاہیں ہے ترے بازو کبھی کٹنے نہیں دوں گی

اور یہی پیغام میں نوجوان نسل کو بھی دینا چاہتی ہوں۔

دعا گو

ڈاکٹر شہناز مزمل

مادرِ دبستانِ لاہور چیئر پرسن ادب سرائے انٹرنیشنل

باطنی صداقتوں کی گواہی

حذیفہ اشرف عاصمی ہمارے گورنمنٹ شالیمار کالج لاہور کی لٹریری سوسائٹی کا صدر رہا ہے۔اس نوجوان کی طبیعت میں توازن اور علم وادب کا شغف فطرتی طور پر موجود ہے۔اس نے زمانہ طالب علمی میں ہی قلم کے ساتھ رشتہ استوار کیا ہوا تھا اور اب اسکا یہی سفر " سوچ کا سفر " بن کر کتاب کی شکل میں جلوہ گر ہے۔اس کی شخصیت کا اہم پہلو عشق رسول ﷺ ہے جو اس کو اپنے والد مکرم جناب صاحبزادہ اشرف عاصمی سے میراث کی صورت میں عطا ہوا ہے۔حذیفہ باصلاحیت جوان ہے جس کی آواز میں جادو ہے۔جب یہ کلاسیکل انداز میں نعت رسول مقبول ﷺ پڑھتا ہے تو دیوانے بے خود ہو جاتے ہیں۔ حذیفہ کی طبیعت میں نیاز مندی، عجز اور ادب کا وافر ہونا اس کی شخصیت کو سحر انگیز بناتا ہے۔

حذیفہ نے علم وادب اور حکمت وتدبر کا انتخاب اس وقت کیا جب اس عمر میں جوان عشق وعاشقی کو حرز جاں بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔عشق کرنے کی عمر میں علم وادب سے ناطہ جوڑنا حذیفہ کا ہی خاصہ ہے۔اس نے مشکل راہ کا انتخاب کیا ہے مگر یاد رہے دنیا میں دائمی زندگی پانے کا یہی راستہ ہے۔اس کا ذوق شعر بھی نفیس ہے۔کبھی کبھی شعر وسخن میں بھی طبع آزمائی کرتا ہے۔اس نے اپنا میدان نثر کو بنایا ہے۔اس کی نثر کسی حسین چہرے کی توصیف نہیں بلکہ الجھے اور پریشان راہروں کو منزل آشنا کرنے کا بھاشن لیے ہوئے ہے۔اس نے اپنی کتاب میں نوجوان نسل کو راستہ اور منزل کی خبر دینے کی کوشش کی ہے۔اس میں یہ کس حد تک کامیاب ہوا ہے اس کا فیصلہ میں آپ پہ چھوڑتا ہوں۔اس کی کتاب کا اک اک حرف اس کی باطنی صداقتوں کی گواہی دئے رہا ہے۔مجھے امید ہے یہ کتاب کئی جوانوں کے لیے زادِ راہ بنے گی اور ان کی زندگی منزل

کی طرف گامزن ہو جائے گی۔ بے مقصدیت اور رستے کے متلاشی جوان اس کتاب سے فیض حاصل کر سکیں گے۔حذیفہ کے من میں ایک بے چین شخص رہتا ہے جو اسکو کچھ کر گزرنے کی جانب مائل کرتا ہے۔یہی بے چینی اور تڑپ حذیفہ کو بڑی راہوں کا مسافر بنا دئے گی۔حذیفہ کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں اور اس امید کے ساتھ کہ یہ اس کی تخلیقی زندگی کی ابتداء ہے ابھی نئے امکانات اور نئی منزلیں اس کی منتظر ہیں۔اللہ تعالی سے دعا ہے کہ حذیفہ کے قلم کی جولانیاں مزید رنگ بکھیر تی رہیں۔خدا تعالی اس کو پیر رومیؒ اور اقبالؒ لاہوری کی فکری میراث کا وراث بننے کی ہمت اور حوصلہ عطا کرئے۔

پروفیسر محمد نعیم ممن
شعبہ اردو گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ شالیمار کالج لاہور

بوسیدہ ماحول میں خوشبو کا سفر

کئی ذہنوں سے ایک معاشرہ بنتا ہے۔ان ذہنوں کے خیالات اور آئیڈیاز خواہ برے ہوں یا اچھے، جب لوگوں کو متاثر کرتے ہیں تو بحث جنم لیتی ہے۔ ہر چیز اپنی ضد کے خلاف اعلانِ جنگ کرتی ہے۔ جو معاشرے کو تشدد کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ شدت پسندی دو مختلف ذہنوں سے لے کر دو مکاتب فکر تک کو متاثر کرتی ہے۔

بہرحال اعتدال ہر معاشرے کی ضرورت ہے۔ قلمی جہاد معاشرے میں سدھار لانے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ایک فرد بھی تحریر سے متاثر ہو کر مثبت رویوں کی راہ پر چل نکلے تو گویا ایک خاندان کے لئے سبق کی طرح آپ کا پیغام پہنچ گیا۔فی زمانہ اس کی کمی کو پورا کرنے کی ضرورت ہے پوری دنیا سمٹ کر جب ایک سکرین پر آ گئی ہے تو اب یہ جہاد ایک تہذیب تک محدود نہیں رہا بہت خوشی ہوتی ہے۔ جب ہمارے نوجوان علمی و ادبی مشاہیر سے متاثر ہو کر انکا پیغام اپنے لفظوں سے دنیا تک پہنچانے کا بیڑہ اُٹھا لیتے ہیں اور اس کو مقصدِ حیات سمجھ کر چل پڑتے ہیں۔حذیفہ ہمارا ایسا ہی سرمایہ ہے جس کے قلم کی خوشبو مجھ تک پہنچتی رہتی ہے یہ خوشبو ہوا کے رَتھ پر سوار جہاں جہاں سے گزرتی ہے اپنا تعارف کراتی ہوئی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ یہ توجہ ہی دراصل کامیابی ہے کہ لوگ آپ کی بات سنیں جب آپ ان کی سماعتوں پر مستقل دستک دیں گے تو یقیناً ذہنوں کے قفل کھلتے چلے جائیں گے حذیفہ کے مضامین اور شاعری متاثر کن حالات کی عکاسی ہے۔اور معاشرے کی فلاح میں اپنا کردار نبھانے کی صلاحیت

سے بھرپور ہیں ان کی تحریر عصری تقاضوں سے مالا مال ہے یہ سنہری حروف جہاں علم میں اضافہ کرتے ہیں وہاں بیمار ذہنوں کی صحت یابی کے لیے کامیاب نسخہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی کے قریب تر لفظوں کا مجموعہ آنے والے دنوں میں حذیفہ کے مضبوط حوالے کے طور پر منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہونے کو تیار ہے۔ کامیابی کی دعائیں ان کی ہم قدم ہیں۔

ڈاکٹر صغرا صدف

ڈائریکٹر جنرل (PILAC)

میرا بیٹا میرا فخر

یہ امر خوشی کا باعث ہے کہ برخوردار حذیفہ اشرف نے کالم نگاری اور شاعری میں یکسوئی اختیاری کی ہوئی ہے اور نبی پاک ﷺ کی نعت لکھتا بھی ہے اور پڑھتا بھی ہے۔ کتاب ''سوچ کا سفر'' یقینی طور پر حذیفہ کی شب و روز کی محنت کا نتیجہ ہے اور حذیفہ نے اِس حوالے سے بہت لگن سے کام کیا ہے۔ حذیفہ اشرف عاصمی کی رہنمائی کے لیے میں محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل، محترم دلاور چوہدری، محترم قمر ریاض، محترم اویس رازی، محترم محمد ناصر اقبال خان، محترم پروفیسر محمد نعیم گھمن، محترم علی احمد کیانی، محترم صاحبزادہ میاں محمد اکرم و دیگر دوستوں کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکرگزار ہوں۔

موجودہ دور میں جب کہ اُردو ادب کی ترویج و اشاعت کی ضرورت و اہمیت حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ سوشل میڈیا کے استعمال نے عوام الناس کو بالعموم اور نوجوان نسل کو بالخصوص اُردو لکھنے پڑھنے سے دور کر دیا ہے۔ اِن حالات میں حذیفہ اشرف عاصمی کی جانب سے یہ کاوش یقینی طور پر قابل ستائش ہے۔ امیدِ واثق ہے کہ ان شاءاللہ حذیفہ اشرف عاصمی کا یہ تخلیقی سفر جاری رہے گا۔ اللہ پاک سے دُعا ہے کہ اللہ پاک حذیفہ اشرف عاصمی کو عمر خضر عطا فرمائے۔

صاحبزادہ اشرف عاصمی ایڈووکیٹ

چیئرمین تاجدارختم نبوت ﷺ

کمیٹی لاہور ہائی کورٹ بار

چیئرمین ہیومن رائٹس فرنٹ انٹرنیشنل

اک سیدھی راہ کا مسافر

برخوردار خذیفہ اشرف عاصمی کی تحریروں کا مجموعہ " سوچ کا سفر " گزشتہ ایک ہفتہ سے میرے تنقیدی مطالعہ کی زد میں ہے۔ اور ادبی تنقید کے مختلف اسالیب وضوابط کو روئے کار لانے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو سیلِ رواں اس نوجوان کے سینے میں موجزن ہے وہ یقیناً بہت جلد اپنے عظیم مقام کو پالے گا۔ بشرطیکہ یہ مشقِ سخن جاری وساری رہے۔

اس کتاب میں مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ جن میں حمد ونعت ﷺ و مضمون نگاری میں زیادہ مضبوط قدمی (Strong Footing) نظر آتی ہے اس میں اس ذہنی وعلمی پسِ منظر کا بھی حصہ ہے جو برخوردار حذیفہ اشرف عاصمی کو اپنے عظیم دادا جو کہ ایک اُستاد بھی تھے اور والد صاحبزادہ میاں اشرف عاصمی صاحب جنہوں نے ایک طویل عرصہ درس و تدریس میں گزارا ہے۔ اور آج کل ہائیکورٹ میں ایک کامیاب وکیل کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں اور تصوف اور عشقِ رسول ﷺ سے وافر حصہ انہیں اپنے نانا اور سلسلہ نوشاہی قادری کے علمبردار ولیِ کامل حضرت حکیم میاں محمد عنایت خان ؒ سے ملا ہے۔ جن سے ایک زمانہ روشناس ہے اس عظیم پسِ منظر کے ہوتے ہوئے یہ اُمید کی جانی چاہیئے۔ کہ سوچ کا یہ سفر علم وآگاہی کی تمام تر کھٹن گھاٹیوں ،نشیب وفراز اور مکر وفریب کے ہر قسم کے جال سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ایک سیدھی راہ " سراط مستقیم " پر چلتا ہوا عشقِ رسول ﷺ کی پُرسکون وپُرآسائش وادی میں جلد اُتر جائے گا۔ ان شاءاللہ

دعا گو

صاحبزادہ محمد حسن علی (سجادہ نشین سخی سائیں محمد شفیع قلندری درازی ؒ)

خلیفہ سائیں سخی قبول محمد ثانیؒ درگاہ سچل سرمست خیر پور سندھ

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے

علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

صاحبزادہ حذیفہ اشرف عاصمی کے کارنامے دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ شعر انہوں نے ایسے ہی نوجوانوں کے لیے کہا تھا۔اتنی چھوٹی سی عمر میں جب بچے ابھی گلیوں میں کھیل رہے ہوتے ہیں انھوں نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں کر ڈالے ہیں۔اپنے ہی ہم عمر لوگوں کی تربیت کی ذمہ داری اٹھا لی ہے اور مثبت طرز زندگی کی طرف ان کی رہنمائی کر رہے ہیں۔اتنی اچھی سوچ میں ان کے صاحب علم والد صاحبزادہ اشرف عاصمی کی تربیت کا بھی حصہ ہے۔جو انسانیت کی خدمت کے لیے ہر دم کوشاں رہتے ہیں۔

صاحبزادہ حذیفہ اشرف عاصمی نے نہ صرف نوجوانوں کی ہمت بڑھانے والے مضامین لکھے ہیں۔بلکہ اپنی کہانیوں اور شاعری کے ذریعے بھی معاشرتی اصلاح کے لیے قلم اٹھایا ہے۔

صاحبزادہ حذیفہ اشرف عاصمی جیسے ہونہار بچے ہی پاکستان کا اصل مستقبل ہیں اور یہ مستقبل ان شاءاللہ نہایت شاندار ہوگا۔۔

میں ان کی پہلی کتاب پر ان کو مبارکباد دیتی ہوں اور دعا گو ہوں۔۔اللہ انہیں ہمیشہ کامیاب و کامران کرے آمین۔

نیلما ناہید درانی (لندن)

30 جنوری 2020

قصہ دل

سوچ کا سفر۔۔۔۔۔۔

ایک علمی و ادبی کاوش ہے جس کا واحد مقصد اظہار ہے۔ مجھے اپنی کم علمی اور فنی استعداد کا ادراک ہے مگر جو نالہء شوریدہ میرے سینے میں موجزن ہوا ہے اسکے سکون کا واحد علاج شاید یہ اظہار ہی تھا۔ سو وہ میں نے کر دیا۔

یہ کاوش قارئینِ کرام کے اذہان کو یقیناً ایک مثبت اور تعمیری مطالعہ کی جانب ایک دعوت ہے۔ پُرسکون اور سوتے ہوئے ضمیروں کو جھنجھوڑنے کا سامان ہے سوچ کا یہ سفر انہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی واحدانیت اور عشقِ رسول ﷺ کی دعوت دیتا ہے وہیں اس مجموعہ میں شامل تبصرے اور کالم حالاتِ حاضرہ کی عکاسی کرتے ہیں، کہانیاں اور افسانے اپنے اندر سموئے ہوئے واقعاتی اور مکالموں کی جاذبیت سے ایک نیا جہاں دکھاتے ہوئے اپنا پیغام ابلاغ کرتے دکھائی دیتے ہیں، اور اقوالِ زریں اپنے اندر تجربات اور وسیع مطالعے کے نتائج سے ذہنوں کی پرورش کرتے ہوئے "سوچ کا سفر" کے قاری کو اپنی زندگی کے سفر کو کامیابی سے طے کرنے کا درس دیتے ہیں۔

میری یہ اپنی سی ایک ناچیز علمی و ادبی کاوش ہے جس کے لیے جہاں میں اپنے اہلِ خانہ خصوصاً اپنے والد صاحبزادہ میاں محمد اشرف عاصمی ایڈووکیٹ کی تربیت اور حوصلہ افزائی کا ممنون ہوں وہیں حق و صداقت اور امانت و دیانت کے سنگلاخ مگر ابدی راستوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جن کو پانے کی پاداش میں کئی رت جگے میرا مقدر ٹھہرے۔

اور تو اور میں نہایت ادب اور احسان مندی کے ساتھ ان عظیم ملکی و غیر ملکی علمی و ادبی مشاہیر کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ جنہوں نے اپنے تہنیتی پیغامات سے میری حوصلہ افزائی فرمائی

بلکہ اپنی قیمتی آراء سے اصلاح فرماتے ہوئے دعاؤں سے نوازا ہے۔"سوچ کا سفر" میرے اس طویل سفر کی داستان عشق وجنوں ہے جو میں نے قلبی وعملی طور پر دھوپ اور چھاؤں میں بنار کے طے کیا ہے۔میرا سفر ہراس انسان کے لئے دعوت ہے جو اس دورِ پرفتن میں راہ عشق وجنوں کا متلاشی ہے۔

اس تصنیف کی تیاری اور اپنے ادبی سفر کے دوران میری بہت سے ادب پرور افراد نے ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ان تمام محبت کرنے والے افراد کا اگر نام لکھوں تو اس کا ایک الگ سے باب بن سکتا ہے۔مگر ان میں سے کچھ خوبصورت نام یہ ہیں۔

محترم حافظ سہیل نذر صاحب،محترم اویس صاحب (پرنسپل گورنمنٹ شالیمار پوسٹ گریجویٹ کالج،لاہور)،محترم نعمان بشیرصاحب (پرنسپل ایکسل اکیڈمی، لاہور)، محترم ارسلان بابرصاحب،محترم عابد شاہ صاحب،محترم نعیم گھمن صاحب،محترم ناصر کھوکھر صاحب،حضرت مولانا خلیل احمد صاحب،محترم ڈاکٹر راحیل رفیق صاحب،محترم صاحبزادہ سید ارباب عظیم ترمزی (مرحوم)،محترمہ مس مہرین یاسین،محترمہ مس سادیہ عمران،محترمہ مس فرزانہ یاسمین،محترم مرزا صہیب اکرام،حافظ محمد ثاقب،محترمہ صائمہ نور، ذیشان یاسین،سید علی رضا، صاحبزادہ حمزہ مصطفیٰ،صاحبزادہ احمد رضا، صاحبزادہ حسن اکرم،صاحبزادہ عمران اشرف،محمد عبداللہ،عاصم طاہر،عثمان اشرف،محمد رضوان راجپوت،محمد قاسم عبد الخالق،حماد قریشی،معین ملہی،فلک زاہد،سادیہ آصف،عالیہ آصف، ماریہ آصف،دیا گوتم شرما،ساجدہ چوہدری اور شمسہ مہران سمیت تمام معتبر افراد کا ہمیشہ دلی شکر گزار رہوں گا۔امید ویقین ہے کہ ان تمام ادبی قدردانوں کا ساتھ ہمیشہ رہے گا ان شاءاللہ۔

صاحبزادہ حذیفہ اشرف عاصمی

huzaifaashraf92@gmail.com

WhatsApp:0307-0476729

حمدِ باری تعالی

مرے عزمِ سفر کو بخش دے تو حوصلہ یا رب
جھلک تو اپنے در کی دیکھنے کو اب بُلا یا رب

جہاں ذکرِ خدا سے نور پاتا ہے ہر اک چہرہ
ہمیں بھی حاضری کا اِذن کرنا تو عطا یا رب

کُھلی آنکھوں سے دیکھوں تو نظر بس تو ہی آتا ہے
بھٹک جاؤں گا میں، مت خود سے تو کرنا جدا یا رب

مری ہر سانس میں دھڑکن میں بس اللہ ہی اللہ ہے
یہی کلمہ رہے لب پہ مرے جاری سدا یا رب

تری مخلوق سے کرتا نہیں ہوں میں تو اب نفرت
حذیفہؔ کا ہے مولا تُو، تو ہی دے گا جزا یا رب

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

سر جُھکانے کے لیے دل سے صدا آتی ہے
میری قسمت میں محمد ﷺ کی ثناء آتی ہے

گنبدِ خضری کو دیکھوں تو صبح ہو میری
میرے دل سے یہی دن رات صدا آتی ہے

ذکر سنتے ہی وضو کر کے وہیں بیٹھ گیا
یہ تو بچپن سے ہی مومن کو ادا آتی ہے

رشک آتا ہے مکینوں پہ مجھے طیبہ کے
کہ مدینے میں انہیں لینے قضا آتی ہے

یہ تو صدقہ ہے محمد ﷺ کے حسیں تلووں کا
کملی والے کی مجھے خوب ثناء آتی ہے

جب حذیفہؔ کو عطا کچھ ہو پڑھے صلی علی
اسکو پھر اپنے گناہوں سے حیا آتی ہے

☆☆☆

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

جوڑ ناطہ مصطفیٰ ﷺ سے چل مدینے چلتے ہیں
عشقِ مصطفیٰ ﷺ میں وہ قسمتیں بدلتے ہیں

اپنے سارے دُکھڑوں کو تُو مدینے لے کے چل
اُن کے در پہ غم بھی تو خوشیوں میں بدلتے ہیں

کیسے انکی چوکھٹ پر خود پہ قابو پاؤں گا
ذکرِ مصطفیٰ ﷺ سے ہی چشمِ تر نکلتے ہیں

جا کر اُنکے در پر میں لوٹ کر بھی آؤں گا
خوش نصیب ہیں کتنے قدموں میں جو پلتے ہیں

میں حذیفہؔ پڑھ کے نعت انکو اب سناؤں گا
بگڑے کاموں کے جہاں پر سلسلے بدلتے ہیں

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

کاش در پہ ترے میری بھی رسائی ہوتی
دور مجھ سے تری دیرینہ جدائی ہوتی

ایک مدت سے مرے دل میں تمنا یہ رہی
سامنے روضے کے محفل بھی سجائی ہوتی

ذکر سنتے ہی وضو کر کے وہیں بیٹھ گیا
کاش طیبہ کی اذاں مجھ کو سنائی ہوتی

اتنا بے چین زیارت کے لیے ہوں آقا ﷺ
اپنے در کی بھی جھلک مجھ کو دکھائی ہوتی

خوش نصیبی ہے جو پلتے ہیں ترے قدموں میں
میری قسمت میں ترے در کی گدائی ہوتی

لمحہ ملتا جو حذیفہؔ کو تری قربت کا
سر جھکائے ہوئے یہ نعت سنائی ہوتی

☆☆☆

شانِ سردارِ جنت

نبی ﷺ کے دیں کو بچایا مرے حسینؓ نے تھا
کلامِ رب بھی سنایا مرے حسینؓ نے تھا

سبھی حیران کھڑے دیکھتے سوئے مقتل
جو کنبہ اپنا لُٹایا مرے حسینؓ نے تھا

جواب سارے سوالوں کے آپ نے تھے دیے
ہر اک کو سب تو بتایا مرے حسینؓ نے تھا

یہ کیسے بھولیں گے کربل سے ننھے اصغرؓ کا
تڑپتا لاشا اُٹھایا مرے حسینؓ نے تھا

شہید ہو کے حذیفہؔ علیؓ کے لاڈلے نے
یذیدیت کو مٹایا مرے حسینؓ نے تھا

آغوشِ مادر کے نام نذرانہ محبت

خدا کا اتنا کرم ہے مجھ پہ کہ میری اس نے بتا دی جنت
خدا نے ہستی بنائی ماں کی اور اس کو میری بنا دی جنت

میں جب بھی اپنے گناہ پہ رویا میں ماں کے قدموں پہ جا کے سویا
اور ماں نے ایسی پلٹ دی کایا کہ خواب میں ہی دِکھا دی جنت

ہے جس نے بھی ماں کا دل دُکھایا تو زندگی میں نہ چین پایا
تو جس نے سمجھا کہ ماں ہے جنت تو ماں نے اُسکو دِلا دی جنت

یہ ماں کے بارے میں پوچھتے ہیں نہیں پتہ انکو اسکا مطلب
بات پہنچی حذیفہ تک تو جھٹ سے اس نے صدا دی جنت

قبلہ والدِ محترم کے نام

چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں، جب اُلجھنے لگتا ہوں
بابا تھپکی دیتے ہیں اور میں ہنسنے لگتا ہوں

میری ہستی اُجڑے بھی گردشِ زمانہ میں
دیکھ باپ کو اپنے پھر سے بسنے لگتا ہوں

باپ سایہ بن کر ہی رہتا ہے ہر اک سر پر
سایہ باپ کا نہ ہو خود سے ڈرنے لگتا ہوں

باپ ہی تو چاہتا ہے آگے نکلوں دنیا میں
تھپکی دیتا کندھے پہ آگے بڑھنے لگتا ہوں

ہو حذیفہؔ سر پہ جب اپنے باپ کی شفقت
کتنی مشکل آجائے اس سے لڑنے لگتا ہوں

استادِ مکرم کی خدمت میں

سمجھ میں اب ہے آیا کیا ہمیں استاد سکھلاتا
ہمیں دے علم کی چابی عقل کا در وہ کھلواتا

کبھی ہم بھول سکتے ہی نہیں استاد کا احساں
بھنور میں ڈوبے جب کشتی کنارہ وہ ہے دکھلاتا

ہماری زندگی میں منفی سوچوں کا لگا ڈیرا
ہماری سوچ کو مثبت یہی استاد بنواتا

حذیفہؔ کے لیے استاد تو روشن ستارہ ہے
اگر بھٹکے تو جگنو بن کے رستہ ہم کو دکھلاتا

نانا جان (پیرِ طریقت حضرت حکیم میاں محمد عنایت خان قادری نوشاہی رحمۃ اللہ علیہ) کی یاد میں

دیکھا نہیں نگاہ نے ایسا کوئی انساں
کہ خوبیاں بھی جس کی نہ کر پائیں ہم بیاں

تھا عشقِ علیؓ عشقِ محمد ﷺ میں گم وہ شخص
ہر وقت ذکرِ رب میں محو رہتی تھی زباں

ہے فخر مجھے قُرب رہا ان کا میسر
میں ذرہِ زمین تھا اور وہ تھے آسماں

تھی ان کی نصیحت کہ بُرا کچھ بھی نہ کرنا
اچھائی کے پرچار میں ہی دے دی اپنی جاں

مدت ہوئی ہے سائے کو اُن کے ترس گئے
سب کے لیے تھے دھوپ میں وہ ایک سائباں

وبا کے دنوں میں دعا

تھا کچھ کے ہی پیچھے یہ وائرس کورونا
سبھی کے ہی پیچھے تو مت اب پڑونا

ملے گا کیا تم کو اِنہیں یوں سَتا کر
یہ سب بے گناہ ہیں اِنہیں مت پڑونا

ترے ڈر سے سب ہی تو یوں ڈر گئے ہیں
مجھے کہتا ہر شخص تم سے ڈرونا

کیے ہیں گناہ جو سبھی بَخش دے گا
خدا کی قسم ہے کہ توبہ کرونا

یہ جو مل رہا ہے ہماری سزا ہے
تم مانگو معافی اور توبہ کرونا

کیے جا رہے ہیں مدد بے گھروں کی
غریبوں پہ تم بھی تو خرچہ کرونا

یہ وائرس ہے جِن سا بُلانے سے آئے
حذیفہؔ یہ کہتا ذکر مت کرونا

مجھے کرپٹ سسٹم سے کہیں آگے بھی لکھنا تھا

نظم: "مجھے کیسے یہ کہتا ہے"

مجھے کیسے یہ کہتا ہے میرے اصنام جیسا بَن
میں کہتا ہوں میں ہوں انساں مجھے حیواں نہیں بننا

مجھے کیسے یہ کہتا ہے سفر ہے تو بھی کر لے گا
میں کہتا ہوں میں ہوں انساں میں اپنی حد میں رہ لونگا

مجھے کیسے یہ کہتا ہے محبت کو دغا دے دے
میں کہتا ہوں کہ وحشت سے مرا دل ڈوب جائے گا

مجھے کیسے یہ کہتا ہے مری آغوش میں آ جا
میں کہتا ہوں ترے چُنگل میں پھنسنا کون چاہے گا

مجھے کیسے یہ کہتا ہے مرے سینے میں تو دھڑکے
میں کہتا ہوں کہ دل مجنوں کا ہوں ہلچل مچا دوں گا

مجھے کیسے یہ کہتا ہے میں تجھ کو روند ڈالوں گا
میں کہتا ہوں کہ جوگی ہوں نیا رستہ نکالوں گا

مجھے کیسے یہ کہتا ہے تری صحبت بھی ہے عصمت
میں کہتا ہوں ترے جیسے ڈَگر سے میں ہٹا دوں گا

مجھے کیسے یہ کہتا ہے سُلگتی آگ میں آ جا
میں کہتا ہوں کہ رَسن و دار مَیں تجھکو بھی لا دونگا

مجھے کیسے یہ کہتا ہے تجھے شاداب کر دوں گا
میں کہتا ہوں کہ ہوں ہیرا مجھے کتنا تراشے گا

مجھے کیسے یہ کہتا ہے گھنیری شَب کے جیسا بن
میں کہتا ہوں کہ تارے چمن کے ہر راہ پر بچھا دوں گا

فیضانِ ساقیِ کوثر ﷺ

جس قوم کے دل میں ہر شے سے بڑھ کر یہ تین محبتیں محبتِ الٰہی محبتِ رسول ﷺ اور محبتِ جہاد ہوں گی دنیا و آخرت میں وہی کامیاب وسرخرو ہوں گی۔اور اگر ان پر دنیاوی محبت غالب آ گئی تو پھر ذلت و رسوائی اس قوم کا مقدر بن جائے گی۔ایک مقام پر نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان دار نہیں ہوسکتا جب تک میری ذات اس کے لیے اپنے مال اولاد، جان و مال اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجائے۔سب سے زیادہ محبت انسان کو اپنی ذات سے ہوتی ہے۔مگر اس فرمان سے یہ واضح ہوگیا ہے کہ اگر کامل ایمان چاہتے ہو تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اپنی ذات سے بھی بڑھ کر محبت کرو۔

چونکہ مسلمان کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت سب سے عظیم اور قیمتی متاع وسرمایہ ہے اسی لیے امت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر تمہیں شیطانی حملوں سے محفوظ رہنا ہے اور دنیا وآخرت کی زندگی کو بہتر بنانا ہے تو ہر مسلمان کو اولاد کی تربیت کرتے وقت اسے جو نصابِ زندگی دینا چاہیے وہ نبی پاک ﷺ کی محبت ہو۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اپنی اولاد کو تین چیزیں سکھاؤ اپنے پیارے آقا ﷺ سے محبت،اہلِ بیت سے محبت اور قرآن کا پڑھنا۔محبتِ رسول ﷺ کی تعلیم بچوں کو دینا اہم فریضہ ہے کیونکہ نبی پاک ﷺ کی محبت ہی ہے جو شریعت مبارکہ پر عمل کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔جب تک مسلمانوں نے اولاد کی تربیت اس نہج پر کی کامیابی نے ان کے قدم چومے۔

اور جب سے محبت کی بنیاد مال وزر بنی تب سے مسلمان کمزور ہوتا چلا گیا اور اُمت زوال کا شکار ہوگئی۔

ان کے جو غلام تھے خلق کے پیشوا رہے
ان سے پھرے جہاں پھر آئی کمی وقار میں

آپ ﷺ کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی جو دوست دشمن سبھی کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ بے شک جناب رسول اکرم ﷺ ہمارے پاس آخری دین لے کر آئے اور دنیا اور آخرت کی زندگانیوں کے لیے ہمارے واسطے ایک صحیح راستہ بتایا۔ انسانیت کو کفر و شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے چمکنے والے نور ایمان کی طرف بندوں کے ظلم سے رب کے عدل کی طرف ایک خالق واحد کی عبادت کی طرف بلایا۔ آپ نے اسلام کو ایسا مذہب بنایا جو اپنے اندر ایک عظیم تہذیب و تمدن کو سموئے ہوئے ہے۔ بلاشبہ تہذیب اسلامی تاریخ میں ایک عظیم تہذیب رہی ہے جس نے ہمارے سروں کو اونچا روز اول سے اونچا کیا ہے۔ ہماری گردنیں بلند رکھیں۔ اور ایک وقت میں ہم نے سارے عالم پر حکومت کی۔

اگرچہ اس کے بعد ہم نے بہت کچھ کھویا ہم نے بہت کچھ گنوایا ہے مگر یہ تھوڑے سے وقت کے لیے ہے۔ ان شاءاللہ اس کے بعد یہ مشکل ختم ہو جائے گی۔ اور از سر نو اسلام اسی طرح چمکے گا جس طرح پہلے چمکتا تھا۔ رسول کریم ﷺ نے تمام انسانیت کو امن و امان اور سکون وطمانیت سے ہمکنار کیا اور اپنے پیروں کاروں کے دلوں میں مادہ، روح خاک اور دین و دنیا کے درمیان صحیح توازن قائم کرنے کا شعور اجاگر کیا مگر شومئی قسمت سے اب ہم یہ توازن کھو بیٹھے ہیں۔ آج ظلمت اور دنیا داری کا پلڑا بھاری ہو چکا ہے۔ آج بے شک اعمال کے اعتبار سے مسلمان جناب رسول اللہ ﷺ کے راستے سے دور ہیں مگر وہ وقت قریب ہے جب مسلمان اپنی حقیقت کو پہچان کر آقا کے دکھائے راستے پر چل کر منزل پالیں گے۔

جب ایمان کا غلبہ، آقا کی محبت اور اسلام کی روحانی کیفیت مسلمانوں میں اوج کمال پر تھی تب ہم نے ہر شے پر قابو پالیا۔ رحمتِ نبوی ﷺ کی جھلکیوں میں سے چند جھلکیاں یہ ہیں کہ ایک عربی بارگاہِ رسالت ﷺ میں مانگنے کے لیے آیا۔ آپ ﷺ نے اس کا دامن مراد بھر دیا

اور پھراس سے پوچھا کہ کیا میں نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے؟ عربی نے جواب دیا آپ نے اچھا معاملہ نہیں کیا اس وقت جو مسلمان وہاں موجود تھے اس کی بات سن کر غضبناک ہو گئے اور بدو کی طرف بڑھے مگر آپ ﷺ نے انہیں رک جانے کا حکم دیا۔اس کے بعد آپ اُٹھے اپنے کاشانہ مبارک میں داخل ہوئے اور بدو کو بلا بھیجا اور پہلے کی نسبت اسے زیادہ مال عطا کیا اور پھر اس سے پوچھا کہ کیا میں نے تیرے ساتھ بھلائی کی؟ بولا ہاں بے شک اللہ آپ ﷺ کو اپنے اہل وعیال اور خاندان والوں کی طرف سے اچھا بدلہ دے تو آپ ﷺ نے عربی سے فرمایا تو نے کہا سو کہا مگر میرے صحابہؓ کے دلوں میں خلش پائی جاتی ہے اگر تو چاہے تو ان کے سامنے بھی وہی کچھ کہہ دے جو میرے سامنے اب کہہ رہا ہے تاکہ تیرے خلاف جو ان کے دلوں میں ہے اس کا ازالہ ہو جائے۔بدو نے عرض کیا سرکار میں ایسا کرنے کے لیے تیار ہوں۔جب دوسرے دن حضور ﷺ تشریف لائے اور صحابہؓ سے فرمایا اس بدو نے جو کہا سو کہا مگر ہم نے اس کو زیادہ مال دیا اب وہ راضی ہو چکا ہے۔چنانچہ بدو نے وہی کلمات صحابہؓ کے سامنے دہرا دیے جو آپ ﷺ کے سامنے کہے تھے۔اس پر جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا میری اور اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس کی ایک اونٹنی ہو اور وہ بھاگ گئی ہو۔لوگوں نے اسے پکڑنے کے لیے اس کا پیچھا کیا مگر اس سے وہ اور بدک گئی۔اس منظر کو دیکھ کر اونٹنی کے مالک نے کہا لوگوں مجھے اور میری اونٹنی کو چھوڑ دو میں تمھاری بہ نسبت اس سے زیادہ نرمی کرنے والا ہوں اور اس کو زیادہ جانتا ہوں۔چنانچہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوا اور اونچی جگہ سے اسے پکڑنے اور اپنی طرف لوٹانے کی کوشش کی وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔اونٹنی اس کے پاس آ گئی اور کجاوا کس کر سوار ہو گیا۔ فرمایا اگر میں تمہیں اجازت دے دیتا کہ جو کچھ اس نے مجھ سے کہا ہے اس بنا پر تم اسے قتل کر دیتے تو وہ جہنم میں چلا جاتا۔

ان کے جو غلام تھے خلق کے پیشوا رہے
ان سے پھرے جہاں پھر آئی کمی وقار میں

اسی طرح ایک لڑکی کا واقعہ ہے۔جو آپ ﷺ کو اس حال میں ملی کہ وہ رورہی تھی۔رونے کا سبب یہ تھا کہ اس کے مالک نے اسے جو آٹا خریدنے کے لیے پیسے دیے تھے۔وہ انہیں گم کربیٹھی تھی۔آپ ﷺ نے آٹا خریدنے کے لیے اسے پیسے بھی دیے اوراس کے ساتھ اس کے مالک کے پاس بھی گئے اور بڑی نرمی سے اور مہربانی کے ساتھ گفتگو فرمائی جس سے متاثر ہو کراس نے لڑکی سے نرم رویہ اختیار کیا اوراسے معاف کر دیا۔

اسی انداز سے چھوٹوں کے ساتھ آپ ﷺ کا طرزِ عمل اوران پر رحمت وشفقت کے واقعات ہیں۔اسی سلسلہ سے ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ کیسے آپ ﷺ کےنواسوں میں سے ایک نواسہ جلدی سے آپ ﷺ کی پشت مبارک پر سوار ہوجاتا ہے جب آپ ﷺ سجدہ کی حالت میں ہوتے ہیں۔آپ ﷺ اپنا سجدہ لمبا کر لیتے ہیں مگر ان کو پریشان نہیں کرتے۔اس وقت آپ ﷺ کی کیفیت کیا ہوتی تھی جب آپ ﷺ نماز پڑھ رہے ہوتے تھے اورکسی بچے کے رونے کی آواز آپ کے کانوں میں آتی تو آپ ﷺ اپنی نماز کومختصر کر لیتے تھے اوراس آواز کی طرف چل پڑتے تھے تاکہ اس بچے کے پاس بھی کوئی ضرور ہونا چاہیے جو اس کے رونے کے عالم میں اس پر رحم کرنے والا ہو۔نبی پاک ﷺ نے جس طرح ہمارے سامنے اپنی مثال رکھی ہمیں چاہیے کہ اپنی زندگی کو اِس طرح ڈھالیں۔اسلام کا سچا ابدی اور حقیقی راستہ صرف ایک واسطے سے ہوکر گزرتا ہے۔اور وہ نبی پاک ﷺ کی مقدس حیات مبارکہ ہے جس پر عمل کر کے آج کا مسلمان جو پستی اورزوال کے ساتھ عبرت کا نشان بن چکا ہے دوبارہ سے دنیا میں کھویا ہو وہ مقام حاصل کرسکتا ہے جب قیصر وکسری اسلام کوتلوار کے سامنے جھکے ہوتے تھے۔ بطور مسلمان یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم حضرت محمّد مصطفیٰ ﷺ کی زندگی کے تمام پہلوں کوسامنے رکھ کر خودکواس کےمطابق ڈھال لیں تاکہ ہم فلاح پاسکیں۔

☆☆☆

ماں کربلائے زیست میں ابرِ بہار ہے

بلندیوں کا بڑے سے بڑا مقام چھوا
اٹھایا ماں نے جب گود میں تب آسمان چھوا

دنیا میں ایسی عظیم ہستی موجود ہے جسے خدا نے بڑی عزت سے نوازا ہے اور بہت بڑے مرتبے پر سرفراز فرمایا ہے۔اس پاک ہستی کو لازوال مقام حاصل ہے۔اس ہستی کا نام ماں ہے۔ماں اپنے بچوں کو ہر طرح کی مشکلات جھیل کر پالتی ہے۔کیونکہ بچے کو سب سے زیادہ ماں کی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ماں ہی وہ ہستی ہے جس کے بغیر گھر سونا سونا لگتا ہے۔ماں اپنے بچوں کو برابری سے پیار کرتی ہے۔

ممتا کے سامنے امیر و غریب سب برابر ہیں۔ ماں اپنے تمام بچوں کو دل و جان سے پیار کرتی ہے۔غریب ہو تو ماں اپنے بچوں کے لیے محنت مزدوری کر کے ان کا پیٹ پالتی ہے۔اور ماں اپنے بچوں کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔ایک ماں خود تو بھوکی سو جائے گی مگر کبھی اپنے بچوں کو بھوکا نہیں رکھے گی کیونکہ وہ ماں ہے۔

اگر کوئی جانور بھی ہو تو اُس کی بھی ماں اُسے اتنا ہی پیار کرتی ہے جتنا کہ ایک ماں کو اپنے بچے کے ساتھ کرنا چاہیے۔اور اگر ماں کو اللہ تعالیٰ نے اتنی عزت نہ بخشی ہوتی تو ماں کی پریشانی دیکھ کر اللہ پاک صفا مروہ کو حج کا رکن نہ بناتا۔

نصیب ہو جائے جس کو ماں کی دعا
مل جائے جس کو باپ کی رضا

مل گئی دولتِ دو جہاں
اُس کے لیے یہی ہے
میرے اللہ و رسولﷺ کی رضا

ماں کا اگر بچہ گُم ہو جائے تو اسے بے چینی سی لگ جاتی ہے۔ وہ اُسے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈتی یہ ایک ماں کی ممتا ہے اور ایک ماں ہونے کے ناطے یہ اس کا فرض ہے۔ جب وہ اسے ملتا ہے تو اسے چومتی ہے اسے گلے لگاتی ہے اسے پیار کرتی ہے اسے اپنے ساتھ ساتھ رکھتی ہے۔ ماں ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

جب بچہ اپنے گھر سے باہر نکلتا ہے تو ماں اس کے لیے دعائیں کرتی رہتی ہے جب تک وہ گھر واپس نہیں آ جاتا اور اسے ذرا سی بھی دیر ہو جائے تو ماں کو بے چینی سی لگ جاتی ہے اُن ماؤں کا کیا حال ہوتا ہو گا جن کے بچے اب اس دنیا میں نہیں رہے ان ماؤں کا کیا حال ہوتا ہو گا جن کے بچے شہید ہو گئے ہیں اُن ماؤں کے بچوں کا کیا قصور تھا جن کے بچوں کے بچپن گولیوں سے چھین لیے گئے۔

سانحہ پشاور میں جس طرح ماؤں کے لختِ جگر لہولہو ہو گئے اور جس طرح مادرِ وطن کے لیے ماؤں نے اپنے لال قربان کر دیئے۔ جن کو دہشت گردوں نے موت کی نیند سُلا دیا اُن کی مائیں تو جیتے جی ہی مر گئی ہوں گی۔

کیا ماں اپنے بچوں کو کبھی بھی اس حالت میں دیکھ پائے گی کیونکہ وہ اس کی اولاد ہے اور وہ نہیں چاہے گی کہ کوئی اسے چھوئے بھی مگر دہشت کے سوداگروں نے تو ماؤں کے لختِ جگر گولیوں سے بھون ڈالے تھے۔ اس ماں کے دل میں کیا گزرتی ہو گی۔ وہ ماں زندہ تو ہو گی مگر صرف جسمانی وہ کھائے گی ضرور مگر اسے محسوس نہیں کر پائے گی۔ وہ پانی پیئے گی مگر اپنے بچے کی یاد میں روتے روتے اس کا پیا ہوا پانی آنسوؤں میں بدل جائے گا۔ یہی ہے ماں کی ممتا۔ ماں ایک انمول تحفہ ہے۔

جب بچہ اپنے کسی امتحان میں چاہے وہ کسی بھی قسم کا امتحان ہو چاہے وہ پڑھائی کا ہو یا کھیل کا ہو اور اُس میں کامیابی حاصل کر لے تو سب سے زیادہ خوشی ماں کو محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ماں ہے۔اور جب بچے کو کچھ ہو جاتا ہے ماں کو ہی سب سے زیادہ دکھ ہوتا ہے۔

یہ بات حقیقت ہے کہ ماں کے پیروں تلے جنت ہے۔اللہ تعالیٰ نے ماں کو بہت بڑا رتبہ عطا کیا ہے۔ماں کے پیروں تلے جنت ہے اور باپ جنت کا دروازہ ہے۔جس نے ان دونوں کو راضی کر لیا تو گویا اس نے رب کو راضی کر لیا۔اپنی جنت کے لئے کچھ اشعار آپ سب کی نذر کر رہا ہوں۔

خدا کا اتنا کرم ہے مجھ پہ کہ میری اس نے بتا دی جنت
خدا نے ہستی بنائی ماں کی اور اس کو میری بنا دی جنت
میں جب بھی اپنے گناہ پہ رویا میں ماں کے قدموں پہ جا کے سویا
اور ماں نے ایسی پلٹ دی کایا کہ خواب میں ہی دِکھا دی جنت
ہے جس نے بھی ماں کا دل دُکھایا تو زندگی میں نہ چین پایا
تو جس نے سمجھا کہ ماں ہے جنت تو ماں نے اسکو دِلا دی جنت
یہ ماں کے بارے میں پوچھتے ہیں نہیں پتہ انکو اسکا مطلب
بات پہنچی حذیفہ تک تو جھٹ سے اس نے صدا دی جنت

جب کسی ماں سے اُس کا لختِ جگر اُس کا بچہ جدا ہو جاتا ہے تو وہ ماں جیتے جی ہی مر جاتی ہے۔مگر یہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ قدرت ہے۔مرنا تو سب کو ہی ہوتا ہے چاہے وہ چھوٹا ہو یا کہ بڑا۔ عظمت سب سے بڑھ کر اسلام میں بہت سی مثالیں ایسی ہیں جس میں ماں کا ذکر ہے کیونکہ ماں کا رتبہ ہی اس معاشرے میں بلند ہے۔

ازقلم

سب رشتوں سے اچھا رشتہ ماں کا رشتہ

بالکل ایسے جیسے جسم اور جاں کا رشتہ

دنیا میں انسان کو جتنے بھی رشتے عطا کئے ہیں ان میں سب سے انمول رشتہ ماں کا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ انسان کے دنیا میں وجود سے قبل ہی شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ ماں کے پیٹ میں پل کر اس سے خوراک پا کر اس کے جسم میں اپنے وجود کی تکمیل کا سفر طے کرتا ہے۔ ماں اپنے وجود کے اندر ایک ننھے وجود میں سمیٹے اس کو چھپائے دنیا میں لانے میں لگ جاتی ہے۔ ماں ہی جانتی ہے کہ اسے اولاد کو پیدا کرنے کا جو تحفہ جو نعمت عطا کی گئی ہے اس کو وہ کس صبر تحمل اور برداشت سے گزارتی ہے۔ ماں کے بلند مقام کی ایک وجہ بھی یہی ہے۔ اولاد ماں کے وجود سے جدا ہو کر دنیا میں آتی ہے۔ مگر کہیں نا کہیں ماں اس سے جڑی رہتی ہے۔ ماں بہت بڑی نعمت ہے جو اس کو پا کر ضائع کر لیں ان سا بدقسمت زمانے میں کوئی نہیں۔ ماں بس دینا جانتی ہے وہ اولاد کو ہمیشہ دیئے جاتی ہے بدلے میں وصول کچھ نہیں کرتی۔ ماں کی قدر کریں۔ اس کے بنا جنّت کا تصور ہی نامکمل ہے۔

☆☆☆

فکرِ اقبالؒ سرمایہ حیات

تصورِ پاکستان کے خالق، مفکرِ پاکستان، حکیم الامت عظیم شاعر و فلسفی ڈاکٹر سر محمد اقبال المعروف علامہ اقبالؒ کا نام قیامِ پاکستان کی تحریک میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔آپ نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ ملک کا تصور پیش کیا۔علامہ اقبالؒ کے آباؤاجداد کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آ کر آباد ہو گئے۔آباواجداد سپرو گوت کے کشمیری پنڈت تھے۔جو غالباً اٹھارویں صدی عیسوی کے شروع میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

علامہ اقبالؒ کے والد شیخ نور محمدؒ درمیانے درجے کے متمول شخص تھے۔دو بھائیوں اور چار بہنوں میں اقبالؒ سب سے چھوٹے تھے۔ابتدائی تعلیم کے بعد سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔بی اے کے سالانہ امتحان میں عربی اور انگریزی میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔علامہ اقبالؒ شروع ہی سے قابل اساتذہ سے وابستہ رہے۔سیالکوٹ میں سید میر حسنؒ سے فیض یاب ہوئے۔1905ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔کیمبرج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1907 میں میونخ یونیورسٹی جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اسی دوران آپ نے بار ایٹ لا بھی کیا اب صحیح معنوں میں آپ کے ادبی اور علمی سفر دنوں کا آغاز تھا۔

علامہ اقبال کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔پہلا دور 1905 اور دوسرا 1905 سے 1908 کا ہے۔اور تیسرا 1908 میں ہندوستان واپس آنے کے بعد شروع ہوا۔ آپؒ کا اندازِ فکر واضح ہو گیا تھا اور آپؒ نے اپنے لیے ایک راستہ متعین کر لیا تھا۔میرے خیال میں اقبالؒ اگر اس وطن کا تصور نہ دیتے تو شاید آج بھی ہم غلامی کی زندگی بسر کر رہے

ہوتے۔علامہ اقبالؒ جو کہ مفکرِ پاکستان ہیں انہوں نے ایک عظیم ملک کا تصور دیا اور قائدِاعظمؒ نے اس تصور کو حقیقت میں بدل کر دیکھایا۔علامہ اقبالؒ محمدﷺ سے عشق کی حد تک محبت رکھتے تھے۔ان کی تعریف بیان کرتے تھکتے نہ تھے۔علامہ اقبالؒ نے قرآن کریم کے بارے میں ایک بہت ہی خوبصورت بات کہی تھی وہ یہ کہ ایک غزنی کے رہنے والے ایک بزرگ عبدالقادرؒ نے علامہ اقبالؒ سے کہا کہ مسلمانانِ عالم کے زوال سے میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ اللہ نے اس قوم سے نظر ہٹالی ہے ان کے الفاظ یہ تھے کہ منہ موڑ لیا ہے۔علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ اللہ نے ان سے منہ نہیں موڑا بلکہ خود انہوں نے قرآن سے منہ موڑ لیا ہے۔اوراس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ساری دنیا میں ذلیل وخوار ہیں۔

اقبالؒ نے فرمایا کہ میں یہ بات آج سے بیس سال پہلے کہہ چکا ہوں''اورتم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہوکر'' علامہ اقبالؒ کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔علامہ اقبالؒ کی شاعری ایسی ہے کہ اُس کا ایک ایک حرف واضح کر دیتا ہے کہ علامہ اقبالؒ اس شعر میں کیا بیان کرنا چاہتے ہیں۔علامہ اقبالؒ کو معلوم تھا کہ دوقومیں آپس میں ایک ساتھ گزر بسر نہیں کرسکتیں ان قوموں کو الگ الگ ملک ملنا چاہیے۔تا کہ ان کے مذہب کی حفاظت ہو سکے۔علامہ اقبالؒ کے 1930ء میں خطبہ الہٰ آباد کے یہ الفاظ تھے۔کہ دوقومیں کبھی بھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں ایک مسلمان اور دوسری ہندوقوم۔ان دونوں کا رہن سہن الگ ہے ان کا اُٹھنا بیٹھنا الگ ہے۔ان دونوں کا کھانا پینا الگ ہے۔مسلمانوں کو ان کا الگ ملک ملنا چاہیے۔تا کہ ان کے مذہب کی قدر کی جا سکے۔پاکستان بہت مشکلوں سے حاصل کیا گیا تھا۔علامہ اقبالؒ کے خیال کے مطابق مسلمانوں کو ایک قوم بن کر زندگی گزارنی چاہیے۔ایک قوم بن کر رہنا چاہیے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رُسولِ ہاشمی

اُن کی جمعیت کا ہے ملک ُنسَب پر انحصار

قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

وطن کا تصور کسی مادی کامیابی کے حصول کی کوشش نہیں تھا بلکہ علامہ اقبالؒ جانتے تھے اگر اس خطہ میں اسلام و مسلمان دونوں کو بچانا ہے تو مسلمانوں کو اپنا الگ ملک حاصل کرنا ہوگا۔ بصورت دیگر یہاں اسلام و مسلمان دونوں اجنبی ہو جائیں گے۔ اقبالؒ وطن کے نوجوان کو درس دے رہے تھے تم کون ہو کیا ہو، تمہاری تخلیق کا مقصد کیا ہے۔ ایک مسلمان کے ذمہ اللہ رب العزت نے فرائض کیا رکھے ہیں اور جس دن وطن حاصل ہوگا اس سرزمین جس کو پاک سرزمین کہا جاتا ہے اس پر بطور مسلمان آپ نے جینا کس طرح ہے۔ مگر آج کا نوجوان جسے اقبالؒ کا شاہین ہونا چاہیے تھا اس نے فکر اقبالؒ کو بھلا دیا۔ نئی نسل نہیں معلوم ہی نہیں کہ اس وطن کے حصول کی خاطر کیا کیا کچھ قربان کیا گیا تھا۔ اور وطن کو بنانے کے پیچھے کون سے اعلی مقاصد کار فرما تھے۔ آج کا نوجوان آزادی کے بعد بھی غلام ہے۔ اگر اب بھی اقبالؒ کی فکر ان کے تصور اور نظریہ کو نہ سمجھا گیا تو وہ وقت دور نہیں جب ہم مزید پستی کا شکار ہو جائیں گے۔ اس لئے وطن عزیز کے قیام اور اقبالؒ کے نظریے کو سمجھنا ہوگا تب ہی یہ وطن دنیا میں وہ مقام حاصل کر سکتا ہے جس کہ خواب بانیان پاکستان نے اس کے قیام کے وقت دیکھے تھے۔

علامہ اقبالؒ نے بچوں کے لیے بھی بہت سی نظمیں لکھیں ہیں۔ جیسے پرندے کی فریاد، مکڑا اور مکھی، ہمدردی وغیرہ۔ علامہ اقبالؒ کی کتابیں بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز بہت مشہور ہیں۔ آج ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں تو وہ صرف علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی کوششوں اور ان کے خون پسینے کی محنت کی وجہ سے ہے۔

افلاطون، فلسفہ اور طرز حکمرانی

سب سے پہلے میں آپکے علم میں اضافہ کیے دیتا ہوں کہ افلاطون کا اصلی خاندانی نام ارسٹوکلیز ہے۔افلاطون (ارسٹوکلیز) کا شُمار مغربی فکر کے عظیم بانیوں میں ہوتا ہے۔قدیم یونانی فلسفی افلاطون کی فکر مغربی سیاسی فلسفہ اور بہت حد تک اخلاقی اور الطبیعیاتی فلسفہ کے نقطہ کے آغاز کو ظاہر کرتی ہے۔ان موضوعات کوتقریباً دو ہزار تین سو برسوں سے مسلسل پڑھا جا رہا ہے۔افلاطون کے گھرانے کے بارے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ افلاطون ایتھنز کے ایک ممتاز گھرانے میں 427 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔

افلاطون نے ایتھنز کو چھوڑ دیا تھا مگر کیوں چھوڑا اُسکی ایک بہت بڑی وجہ سامنے آتی ہے کہ نوجوانی میں افلاطون کی ملاقات فلسفی سقراط سے ہوئی۔جو اس کا دوست اور رہنما بن گیا افلاطون کے دل میں جمہوری حکومت کے لیےنفرت پیدا ہوئی مگر وہ کیسے؟ اُسکی وجہ اُسکا دوست ہی بنا۔ 399 قبل مسیح میں ستر برس کی عمر میں سقراط پر بے دینی اور ایتھنز کے نوجوانوں کو ورغلانے کےمبہم الزامات کےتحت مقدمہ چلایا گیا اور مقدمے کے فیصلے میں آخر کار اس کو موت کی سزا سنادی گئی۔

افلاطون کے الفاظ میں سقراط ''دانا ترین, عادل ترین اور ان تمام لوگوں سے بہترین ہے جن سے آج تک مل پایا ہوں اور یہی وجہ بنی کہ سقراط کی موت نے افلاطون کے دل میں جمہوری حکومت کے لیےایک مستقل نفرت بھر دی اور ایتھنز چھوڑنے کی بھی یہی وجہ بنی۔سقراط کی موت کے کچھ عرصے بعد افلاطون نے ایتھینز چھوڑ دیا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اگلے دس یا بارہ برس اس نے سفر میں گزارے۔387 قبل مسیح کےقریب وہ ایتھینز واپس آیا اور ایک مدرسہ

کی بنیاد رکھی۔ جسے اکادمی (اکیڈمی) کا نام دیا۔

جونوسوسال سے زائد عرصہ تک قائم رہی۔افلاطون نے زندگی کے بقیہ چالیس برس ایتھینز میں گزارے۔وہ فلسفہ کی تدریس کرتا اور لکھتا رہا۔یوں تو افلاطون کے شاگردوں کی تعداد لا تعداد تھی مگر ان میں سے ایک بہت معروف شاگرد ارسطو تھا جو سترہ سال کی عمر میں اکادمی میں داخل ہوا۔جب ارسطو اکادمی میں آیا تب افلاطون کی عمر ساٹھ سال تھی۔افلاطون 80 برس کی عمر میں 347 میں وفات پا گیا۔وہ زندگی کے 80 برس ہی دیکھ پایا تھا۔افلاطون ایک بہت ہی قابل اور ماہر فلسفی تھا افلاطون نے قریباً چھتیس کتابیں تحریر کیں۔جن میں سے بیشتر سیاسی اوراخلاقی مسائل پر مبنی ہیں۔اس کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں لکھیں جن میں الطبیعات اورالہیات بھی موجود ہیں۔افلاطون جیسے عظیم فلسفی کی عظیم تحریروں کو یہاں چند سطروں میں اجمالاً بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔

مگر افلاطون کی معروف کتاب 'جمہوریہ' میں موجود اس کے اہم سیاسی نظریات کو اجمالاً بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔جس میں ایک مثالی معاشرے کا تصور پیش کیا گیا ہے۔افلاطون کے خیال میں بہترین حکومت اشرافیہ کی حکومت ہے۔اس سے اس کی مراد کسی وراثتی اشرافیہ سے نہیں تھی۔ بلکہ یہ ایک معتبر اشرافیہ ہے۔یعنی یہ کہ بہترین اور دانا ترین افراد ریاست پر حکومت کریں گے۔ان کا انتخاب شہریوں کی رائے دہندگی کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ بلکہ باہمی معاونت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ جولوگ پہلے سے سرپرست طبقہ رکن ہیں۔انہیں اضافی اراکین کا سخت معیار پر انتخاب کرنا چاہیے افلاطون کا خیال تھا کہ سرپرست طبقہ کے لیے مرد اور عورت کے لیے کوئی تخصیص نہیں ہے وہ پہلا اہم فلسفی تھا اور آئندہ طویل عرصہ تک کوئی دوسرا اس جیسا پیدا نہ ہوا جس نے عورت اور مرد کی برابری کی بات کی اور یہ کہا کہ دونوں کو ہر طرح کے مواقع سے مستفید ہونے کا برابر حق حاصل ہے۔افلاطون نے ریاست کو بچوں کی نگہداشت کا ذمہ دار قرار دیا۔اس نے شاعری اور موسیقی وغیرہ کو ممنوعہ علوم قرار دیا۔اس نے ایک مکمل تعلیمی نظام دیا کہ ریاضیات اور

دیگر مدرساتی علوم کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

متعدد مراحل پر شدید آزمائش کر لینی چاہیے ایک کم کامیاب انسان میں معاشرے کی معاشی فعالیت کی پرکھ ہونی چاہیے۔ جبکہ زیادہ کامیاب لوگوں کو مسلسل مزید تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ اس اضافی تعلیم میں نا صرف عمومی مدرساتی موضوعات شامل ہوں بلکہ یہ فلسفہ کی تربیت کا بھی احاطہ کرے۔ جس سے افلاطون کی مراد دراصل مثالی اشکال کے اپنے مابعد الطبیاتی نظریہ کی تدریس تھی۔ پینتیس برس کی عمر میں جو لوگ نظریاتی ضوابط پر عبور حاصل کر لیں۔ انہیں مزید پندرہ برس تربیت دی جائے گی۔ جو عملی تجربہ پر مبنی ہو گی صرف یہی افراد جو یہ ثابت کریں وہ اپنے کتابی علم کو حقیقی دنیا پر عملاً منطبق کر سکتے ہیں۔ سرپرست طبقہ میں جگہ پا سکیں گے۔ مزید یہ کہ صرف وہی لوگ جو واضح طور یہ ظاہر کر دیں کہ وہ بنیادی طور پر عوامی فلاح میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

خود سرپرست بن سکیں گے۔ تاہم ہر کوئی سرپرست طبقہ میں داخل ہونے کا مجاز نہیں ہو گا۔ سرپرست طبقہ دولت مند نہیں ہو گا سرپرستوں کو صرف ایک معمولی حد تک ذاتی جائیداد پاس رکھنے کی اجازت ہو گی۔ ان کی نہ کوئی زمین ہو گی نہ کوئی ذاتی گھر انہیں ایک مخصوص مشاہرہ ملے گا۔ جو ہرگز زیادہ نہیں ہو گا۔ انہیں سونا چاندی اپنے پاس رکھنے کا حق نہ ہو گا۔ سرپرست طبقہ کے افراد کو علیحدہ گھر بنانے کی بھی ممانعت ہو گی۔

افلاطون اپنے وقت میں اور پھر بعد آنے اہل فلاسفہ میں اہم نمایاں اور واضح حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا بیان کیا ہوا ریاستی نمونہ آج بھی دنیا بھر میں معتبر مانا اور سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بہت سے افکار پر جرح کی جا سکتی ہے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات ماننی پڑے گی کہ آج کی دنیا میں تمام ممالک میں قابض افراد جو خود کو اشرافیہ کہتے ہیں ان کا افلاطون کی بیان کی گئی اشرفیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ حق حکمرانی پر افلاطون کے قوانین اتنے سخت اور واضح ہیں کہ ان پر اگر عمل کیا جاتا تو ممکن تھا آج کا موجودہ ڈھانچہ گر جاتا۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکا کیوں کہ طاقت ور طبقہ یہ کبھی نہیں چاہتا کہ اس کی طاقت اور اقتدار کو کوئی خطرہ ہو۔ ہم کہہ سکتے ہیں یہ عظیم یونانی انسان

کائنات کے اہم ترین دماغوں میں سے ایک تھا۔

افلاطون نے تقریباً دو ہزار سال قبل یہ بات حکمران اشرافیہ کے لیے طے کر دی تھی کہ جس نے حکمرانی کرنی ہے اُس نے پھر دولت نہیں کمانی اُس نے بس پھر خدمت کرنی ہے۔ معاشرے کے لیے سرپرست بن کر رہنا ہے۔دولت کے انبار نہیں لگانے۔ موجودہ دور کی اشرافیہ نے عوام کا لہو چوس لیا ہے۔ پاکستان کی حد تک تو ایسا ہی نظر آتا ہے۔۔۔!!!

☆☆☆

سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے

سوچ کے سفر کا پہلا قدم اس کالم سے رکھا گیا تھا

پاکستان بننے سے پہلے ہر مسلمان سمجھتا تھا کہ اُس کے مذہب کو خطرہ ہے۔مسلمان جانتے تھے کہ دوقومیں ایک ساتھ گزر بسر نھیں کرسکتیں۔اور وہ قومیں مسلمان اور ہندو تھیں۔علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبہ الہ آباد میں کچھ نکات مسلمانوں کے سامنے رکھے تھے اور وہ الفاظ کچھ اسطرح تھے۔کہ مسلمان اور ہندو ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اتنے سال ایک ساتھ رہنے کے باوجود بھی یہ ایک نہ ہو پائے کیونکہ ان کا رہن سہن الگ الگ ہے۔ان کا اُٹھنا بیٹھنا رسم ورواج سب کچھ تو ایک دوسرے سے مختلف ہے۔پاکستان بننے سے پہلے ہر مسلمان کی زبان پر پورے جوش وجذبے کے ساتھ ایک ہی نعرہ تھا کہ لے کر رہیں گے پاکستان بن کر رہے گا پاکستان۔اور میرے پیارے پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے جناب قائداعظمؒ نے اور ان کی بہن محترمہ فاطمہ جناحؒ اور قائداعظمؒ کی قیادت میں مسلمانوں نے لازوال قربانیاں دے کر آزادی حاصل کی اور یہ وطن میری دھرتی میرے پاکستان کو آزاد کروانے کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ مقصد مسلمانوں کو ان کا حق دلوانا تھا۔اور قائداعظمؒ اپنے مشن پر پورا اُترے۔مقصد میں کامیاب رہے۔کیونکہ اس کے پیش نظر جدوجہد کا مقصد ذاتی نہیں بلکہ قومی تھا۔

اللہ پاک کی مرضی بھی یہی تھی کہ پاکستان بنے اور مسلمانوں کو آزادی میسر آئے اور جو خدا چاہتا ہے وہ ٹل نہیں سکتا۔قاعداعظمؒ کے ساتھ اللہ پاک کی رضا تھی جو ان کو دشمنوں کے خلاف لڑنے کی قوت بخشتی رہی۔اور ایک دن ایسا آیا 14 اگست 1947 کو ایک سورج طلوع ہوا اور اس دن ہمارا پیارا وطن آزاد ہوا۔اور سب کی زبان پر ایک ہے نعرا بلند تھا کہ پاکستان زندہ

باد قاعداعظمؒ زندہ باد۔ پاکستان کا نام لاالہ الا اللہ کی بنیاد پر ہی رکھا گیا۔اور پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الا اللہ۔ پاکستان بننے کے بعد ہر مسلمان اور پاکستانی کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا کہ جب تک سورج چاند رہے گا پاکستان کا نام رہے گا۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔اِسے بنانے کے لیے بہت سی ماوں بہنوں نے اپنی عصمتوں کی قربانیاں دیں اور بہت سے شہیدوں نے اپنے خون سے آزادی کا ترانہ لکھا۔مسلمانوں پر بہت سے ظلم ڈھائے گے مگر پھر بھی ہمارے مجاہد صفت لوگ سچائی کی راہ سے پیچھے نہ ہٹے۔

اے وطن تو نے پُکارا تو لہو کھول اٹھا

تیرے بیٹے تیرے غازی تیرے جانباز چلے آتے ہیں

پاکستانیوں نے کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے دن رات محنت کی ہے اور آج ہمیں دیکھتے ہیں کہ پاکستان ایک ایٹمی ملک بن چکا ہے۔

ہمارے عظیم رہنما قائداعظمؒ،علامہ اقبالؒ اوران کے ساتھیوں نے ملک کر پاکستان کو قائم کیا۔آگ اورخون کے سمندرعبور کر کے یہ مقدس دھرتی حاصل کی۔

جناب قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ایسے ہی یہ الفاظ بیان نہیں کیے کہ پاکستان کی حفاظت کے لیے میں تنہا لڑوں گا اس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ موجود ہیں۔ مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ اگر آپ کو پاکستان کے لیے جنگ لڑنی پڑے تو کسی صورت ہتھیار نہ ڈالیں اورصحراوں، میدانوں، جنگلوں اورسمندروں میں جنگ جاری رکھیں۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی اس بات پر ہم ان شاء اللہ پورا اتریں گے۔اور پاکستان کوایک امن و سکون والا وطن بنانا قائداعظمؒ کی خواہش تھی اوراس خواہش کوصرف آنے والی نسلیں ہی پورا کر سکتی ہیں۔اور یہ ہم پر بطور مسلماں بلکہ سب سے بڑھ کر پاکستانی ہونے کے ناطے فرض ہے کہ ہم قاعد اعظمؒ کے مشن کو پورا کریں پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے جو قربانیاں دی گئی ہیں ان کا بھرم ہم قائم رکھیں۔ یہ قربانیاں ہمیں پل پل یاد دلاتی ہے کہ ہم پاکستانی ہیں اور ہمیں پاکستانی ہونے کا

فرض ادا کرنا ہے۔

دوسرے ممالک یہ سوچتے ہیں کہ پاکستان میں ٹیلنٹ نہیں ہیں اگر پاکستانیوں میں ٹیلنٹ نہ ہوتا تو ڈاکٹر عبدلقدیر خان ایٹم بم نہ بنا پاتے اور پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ بچے جیسے کہ ارفع کریم رندھاوا،علی معین نوازش،شایان انیق،عمار افضل،شاہ زیب حسین،ستارہ اکبر اور موسیٰ فیروز جیسے بچے پاکستان کا نام روشن نہ کرتے۔پاکستانی ایک قوم ہے جب تک پاکستانی ایک ساتھ ملکر رہیں گے تب تک کوئی بھی ہمارا کچھ نھیں بگاڑ سکتا۔اور بے شک خدا سچائی کا ساتھ دیتا ہیں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ
کہ خاص ہے ترکیب میں قوم ِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمیعت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے ہے جمیعت تیری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمیعت کہاں
جمیعت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

پاکستانی قوم مل کر یہ کرپشن کی لعنت کو ختم کر سکتی ہیں۔لوڈ شیڈنگ جیسی لعنت اور دہشت گردی کی لعنت کو جڑ سے اُکھاڑ کر باہر پھینک سکتے کیونکہ یہ وہ پاکستان نہیں جسے کسی کے ٹکڑوں پر پلنے کی عادت ہے یہ میرا پاکستان ہے یہ میرے قائدؒ کا پاکستان ہے۔ان شاءاللہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب یہ اپنا ہاتھ اٹھائے گا تو وہ ہاتھ کچھ لینے کے لیے نہیں اُٹھے گا بلکہ دینے کے لیے اُٹھے گا ہم وہ پاکستانی نہیں جو کسی کے ٹکڑوں پر پلتے ہے ہم وہ پاکستانی ہیں جو اپنے بل بوتے پر جئیں گے۔ہم اپنی محنت سے پاکستان کو بلندیوں تک پہنچائیں گے۔

وطن کے قیام کے وقت ہمارے آباواجداد نے اپنی جانوں کا نذرانہ اس لئے دیا تھا کہ ہم آزاد فضا میں سانس لے سکیں اور یہ وطن دنیا کے نقشے پر بلند و بالا مقام حاصل کر سکے۔ آزادی

کے بعد آج دہائیاں گزر گئی ہیں ہم کو ہمارا وطن آواز دیتا ہے۔ ہم افسوس ہم میں سے بہت سے افراد آج ذاتی چاہ کا شکار ہیں۔ اس سے پہلے کب پانی سر سے اونچا ہو جائے ہم سب کو سوچنا ہوگا کہ ملک قائم کیوں ہوا تھا اس کی خاطر خون کیوں بہایا گیا تھا۔اگر ہم وہ سراغ وہ راز اپنی روح تک پہنچا دیں گے تب ہی ہم گھٹا ٹوپ اندھیرے سے روشنی کی جانب سفر کر سکیں گے۔وطن عزیز کے ہم پر بہت سے قرض ہیں اب وقت ہے کہ ہم ان کو پورا کرنے کا سوچیں۔ تا کہ یہ وطن دنیا میں روشن مثال بن کر ابھرے تب ہی قائد و اقبالؒ کی روح کو سکون ملے گا۔

پاکستان زندہ آباد۔

☆☆☆

باپ سراں دے تاج

عزیز تر مجھے رکھتا ہے وہ رگِ جاں سے
یہ بات سچ ہے میرا باپ کم نہیں ماں سے

آپ کو اس دنیا میں بہت کم ایسے لوگ ملیں گے جو خود سے بھی زیادہ آپکو کامیاب دیکھنا چاہیں گے۔ یہ تو ہوگئی بات لوگوں کے متعلق، لیکن میں بات کرنے جارہا ہوں ایسی ہستی کی جس کا رتبہ بہت بلند ہے میں بات کررہا ہوں باپ کی جی ہاں باپ ہی ایسی ہستی ہے جو آپکو خود سے بھی ذیادہ کامیاب دیکھنا چاہتی ہے۔ باپ ایک ایسی کتاب کا نام ہے جس پر بہت سے تجربات تحریر ہوتے ہیں جو زندگی گزارنے میں رہنمائی فرمانے کے ساتھ ساتھ زندگی کا اصل مطلب بھی بتایا کرتے ہیں۔

والدین میرے اللہ کی عطاء کردہ ایک ایسی انمول نعمت ہیں جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ باپ کی شفقت وسرپرستی اور ماں کا سایہءآغوش انسان کو زندگی کی معراج تک لے جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً ماں کی شان میں بے شمار الفاظ لکھے اور بیان کیے گئے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ماں کی خدمت اور اطاعت کرنے پر زور دیا جاتا ہے جو کہ یقیناً درست بھی ہے۔ لیکن اس دوران باپ کی ذات کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ آفاقی کتاب قرآن مجید میں جگہ جگہ لفظ ''والدین'' استعمال ہوا ہے۔ جس سے مراد ماں اور باپ دونوں ہیں۔ یہاں ایک بات واضح رہے کہ میرا مقصود ماں اور باپ کے درجات کا تقابل نہیں ہے بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ باپ کا درجہ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا ماں کا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ماں اور باپ کی یکساں طور پر خدمت کی جائے خصوصاً جب وہ بڑھاپے کی عمر میں پہنچیں تو ان کی خدمت میں کوئی

کسر نہ چھوڑی جائے۔

باپ کا دل اور سینہ بہت وسیع ہوتا ہے اسکے سینے میں اولاد کے لیے موجزن پدرانہ شفقت، اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے عمر بھر کی ریاضت، ان کی بہترین تربیت اور بحیثیت باپ اولاد کی تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی سعی۔ یہ وہ عوامل ہیں جو ایک باپ کو بہترین اور مثالی باپ کے عہدے پر فائز کرتے ہیں۔

ایک باپ جو صبح سے شام تک اولاد کی پرورش ان کی تربیت کے سلسلہ میں بے چین رہتا ہے وہ اس خیال میں محو رہتا ہے کہ اخراجات کی تکمیل کیسے ہو؟ اس کا مقام بیان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: باپ جنت کے دروازوں میں بیچ کا دروازہ ہے، اگر تو چاہے تو اس دروازے کی حفاظت کر یا اس کو ضائع کردے۔ ایک اور موقعہ پر ایک صحابی رسول ﷺ آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کرنے لگے کہ میرے والد میرے مال سے خرچ کرنا چاہتے ہیں، ایسے موقع پر میں کیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا، ''تو اور تیرا مال تیرے والد ہی کے لیے ہے''۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے والد کا مقام و مرتبہ بیان کرتے ہوئے اولاد کے مال میں والد کا استحقاق قرار دیا۔

یہاں ایک بات بتا تا چلوں کہ والدین کی خوشنودی اللہ کی خوشنودی ہوتی ہے۔ انسان کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے کہ اللہ کو راضی کرے، اس کو حاصل کرنے کا آسان طریقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا: بندے سے اللہ کا راضی ہونا بندے سے اللہ کا ناراض ہونا والدین کی رضا مندی وناراضگی کے ساتھ معلق ہے۔ ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رب کی رضامندی والد کی رضا مندی میں ہے، رب کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔ والدین کی رضامندی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا اہم قرار دیا کہ ان کی رضامندی پر اپنی رضامندی موقوف کردی، والدین کو ناراض رکھ کر اللہ کو راضی کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری جتنی کامیابیاں ہیں وہ سب باپ کی ہی بدولت ہوتی ہیں اور انہی کے لئے

ہوتی ہیں میں اگر اپنی بات کروں تو مجھے میرے والد صاحب نے بولنے اور چلنے ساتھ ساتھ لکھنا بھی سکھایا مجھے اس معاشرے میں سانس لینا سکھایا میرے کندھے پر تھپکی دے کر مجھے منزل تک پہنچایا ہر قدم پر آنے والی مشکلات سے بچایا میں گر جاتا تو مجھے اُٹھنا سکھایا میں ہار کے ڈر اگر پیچھے ہٹ جاتا تو مجھے حوصلہ و ہمت دیا میں یہاں اگر وغیرہ لکھ دوں تو کچھ غلط نہ ہوگا کیونکہ والد صاحب ہمیں وہ کچھ سمجھا دیتے جو بیان کرنا مشکل ہوتا ہے وہ کچھ سکھا دیتے جسے دوسروں تک پہنچانے کے لئے الفاظ ختم ہو جاتے۔ ہماری خواہشات کا اتنا خیال ہوتا ہے کہ ہمارے چہرے پر اداسی آنے سے پہلے ہی من چاہی چیز ہاتھ میں تھما دیتے۔ اللہ نے ماں اور باپ جیسا رشتہ محبت کا رشتہ بنایا ہے یہ اخلاق سکھاتے ہیں یہ جینا سکھاتے ہیں یہ محبت اور محنت کرنا سکھاتے ہیں۔ بدترین ہیں وہ لوگ جو والدین جیسی نعمت پاس ہوتے ہوئے بھی ان کی قدر نہیں کرتے ان کو خوش کر کے اپنے اللہ کو راضی نہیں کرتے۔

ماں باپ سے رشتہ تو کسی لالچ کے بغیر ہوتا ان سے انس ہوتا ہے باپ رازدان ہوتا ہے۔ ان سے دل کی باتیں کر کے سکون محسوس ہوتا۔ جب ہم باہر سے گھر آتے ہیں تو ماں کا چہرہ دیکھنے کے لئے بے چین ہوتے ہیں اور جب والد صاحب گھر آتے ہیں تو انکا چہرہ دیکھ کر سکون پاتے ہیں۔

میرا یہاں ایک سوال ہے کہ ایک باپ جو تھکن سے چور بھی ہو جائے تو بھی ہمارا پیٹ پالنے کے لئے ہار نہیں مانتا اسی باپ کے آگے آنکھیں دکھانا کہاں کا انصاف ہے آج کا یہ دور یہ بے حیائی کا دور جس میں باپ کی عزت کی لاج نہیں رکھی جاتی کئی باپ تو اپنی عزت بچانے کے چکر میں منہ چھپاتے پھرتے ہیں کیونکہ انکی اولاد کوئی اتنا اچھا کام نہیں کر رہی ہوتی جس پر باپ کا سینہ فخر سے چوڑا ہو سکے اولاد تو چالوں اور باتوں میں آ کر والدین کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے چند دن کی خوشی کے لئے باپ کی سالوں کی محبت بھلا دیتے ہیں کیا ہم ایسا ہی نہیں کرتے؟ بے شک سب ایسا نہیں کرتے مگر جو کرتے ہیں انہیں یہ سمجھنا ہوگا خدا کی یہ نعمت آج بھی

اگر آپ کے پاس موجود ہے تو اسکی قدر کریں کیونکہ میں نے بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھے جو کہتے ہیں کہ کاش ہم اپنے والدین کی عزت کر لیتے انکی خدمت کر لیتے آج وہ ہم میں نہیں رہے۔ پھر یہ پچھتاوا کسی کام کا نہیں رہتا ہمیں انکو خوش رکھنا ہوگا جب ہم بڑے ہو جائیں تو انکی ذمہ داری اُٹھانا ہمارا فرض ہے جیسے کہ انہوں نے ہماری اُٹھائی۔

ماں اور بیٹی آپس میں سہیلی جیسی ہوتی ہیں تو باپ اور بیٹا بھی ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یار بن جاتے ہیں۔ باپ کی زندگی اس کا فخر اپنے بیٹے کی کامیابی میں پنہاں ہوتا ہے۔ ماں کے آنسو بھی انمول ہوتے ہیں. ہم نے دیکھا ہے کہ ماں کی شان کے شایان شان ہزاروں صفحات دنیا کے ہر ادب میں موجود ہیں لیکن باپ کی آنکھ کے آنسو اس کی محنت اس کی مشقت اس کی تلخی ایام کو بیان کرتے وقت ہر شاعر و ادیب کا قلم حق ادا کرنے سے محروم نظر آتا ہے۔ دفتروں کے جنگل میں سر جھکائے اولاد کے لئے رزق حلال کی جستجو میں محو انسان جس کو ہم باپ کہتے ہیں وہ اپنی اولاد کے نوالوں کی خاطر کہاں کہاں جھک جاتا ہے کہاں کہاں اپنی عزت نفس بھی پس پشت ڈال دیتا ہے ہم میں سے اکثر لوگ یہ تب تک نہیں جان پاتے جب تک ہم خود باپ کے عظیم درجہ پر فائز نا ہو جائیں۔ بھوکا تھا کہ ہارا کمزور باپ سارے زمانے سے جھوجھ کر جب خالی ہاتھ گھر آتا ہے تو اس کے پاس سوائے اپنی اولاد کی فکر کے کوئی دوسری فکر نہیں ہوتی۔

بقول شاعر ؎

شام کو خالی ہاتھ جب گھر جاتا ہوں میں
مسکرا دیتے ہیں بچے اور مر جاتا ہوں میں

باپ سارا دن کرب سے گزر کر بچوں کے لئے رزق تن ڈھانپنے کے لئے لباس اور تعلیم کی خاطر اپنی جوان ہڈیوں کو بوڑھا کرتا ہے تو اس وقت اولاد نہیں جان پاتی کہ کہاں کہاں ایک باپ اپنے ضمیر کا سودا کر جاتا ہے تمام مسائل جھیل کر باپ خود جل کر مٹ کر بچوں کے چہروں پر خوشی لانے کی کوشش میں باپ کب بوڑھا ہو جاتا ہے اس کا اندازہ خود باپ کو بھی ہو ہی

نہیں پا تا۔باپ زمانے کی تند و تیز دھوپ میں ایسا شجر سایہ دار ہے جو دھوپ کی تمام تمازت سہہ کر اپنے بچوں کو چھاؤں عطا کرتا ہے۔اس کے چہرے کے جھریاں اس کے بچوں کو جوانی نصیب کرتی ہیں۔اسکی جھکی کمر کی بدولت اولاد کا سینہ چوڑا اور سر بلند ہوتا ہے۔یہ وہ سمندر ہے جس کی ہر بوند اس کے اپنوں کے لئے ہوتی ہے خود پیاسا رہ کر اولاد کے حلق تر کرتا ہے۔خود بھوک برداشت کر کے اولاد کے شکم کی آگ ٹھنڈی کرنے والے کمزور سے فولادی انسان کو دنیا باپ کہتی ہے۔یہ ایسا سہارا ہے جو بیٹی ہو یا بیٹا ان کے کی نیند کی خاطر اپنی بھرپور جوانی رت جگھوں کے حوالے کر دیتا ہے۔اسے خبر ہوتی ہے کہ وہ سودا نہیں فرض ادا کرتا ہے پر اسے کسی صلے کی تمنا ہوتی ہے نا ستائش کی آرزو،وہ تو بنا ہی قربانی ایثا کی مٹی سے ہوتا ہے جو خود ڈھے کر اولاد کو مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔

کاش اولاد باپ کی زندگی میں اس کو سمجھ کر اس کو وہ مقام دے سکیں جس کا وہ حقدار ہوتا ہے۔یہ واحد ہستی ہوتی ہے جو خود مٹ کر اولاد کو وجود عطا کرتی ہے۔اپنے والدین کی قدر کریں اس کے سے قبل کے ہاتھ میں پچھتاوا اور آنکھوں میں بس آنسو رہ جائیں۔

آج فادرز ڈے کے موقع پر میں نے اپنی عقیدت کا اظہار شاعری سے بھی کرنا چاہا ہے میرے والد صاحب کے لیے تحفہ اور آپ سب کی نذر کرتا ہوں۔

چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں،جب الجھنے لگتا ہوں
بابا تھپکی دیتے ہیں اور میں ہنسنے لگتا ہوں

میری ہستی اجڑے بھی گردشِ زمانہ میں
دیکھ باپ کو اپنے پھر سے بسنے لگتا ہوں

باپ سایہ بن کر ہی رہتا ہے ہر اک سر پر
سایہ باپ کا نہ ہو خود سے ڈرنے لگتا ہوں

باپ ہی تو چاہتا ہے آگے نکلوں دنیا میں
تھپکی دیتا کندھے پہ آگے بڑھنے لگتا ہوں

ہو حذیفہ سر پہ جب اپنے باپ کی شفقت
کتنی مشکل آجائے اس سے لڑنے لگتا ہوں

☆☆☆

ستمبر عہدِ وفا کا مہینہ

چھ ستمبر ہماری قومی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنے کی قومی خواہش کی غمازی کرتا ہے۔ ہماری مسلح افواج کو دنیا کی دوسری افواج پر اس لئے بھی برتری اور فوقیت حاصل رہی ہے کہ اس نے انتہائی کٹھن اور نامساعد حالات اور سازشوں کے باوجود اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی بجا آوری میں بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ اس میں عسکری مہارت اور تربیت کے ساتھ جذبہ جہاد اور قوت ایمانی کا ہتھیار سب سے موثر اور کارگر رہا ہے۔ اللہ پاک نے ہمارے عسکری جوانوں اور افسروں کو قوت ایمانی کی جس دولت سے نواز رکھا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم سے دس گنا بڑی طاقت کا حامل دشمن بھی ہر وقت ہم سے لرزاں اور خوفزدہ رہتا ہے۔

6 ستمبر 1965 ہماری عسکری تاریخ کا انتہائی اہم ترین دن ہے۔ یہ ہمیں جنگ ستمبر کے ان دنوں کی یاد دلاتا ہے جب پاکستان کی مسلح افواج اور پوری قوم نے بھارتی جارحیت کے خلاف اپنی آزادی اور قومی وقار کا دفاع کیا تھا اس دن بہادر پاکستانی شہریوں نے اپنی مسلح افواج کے ساتھ یکجہتی کا بے مثال مظاہرہ کیا اور یہ جنگ پاکستانی قوم اور مسلح افواج کی وہ مشترکہ جدوجہد تھی جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام کرتی رہے گی۔ اس تاریخی دن کے ساتھ ایسی انمٹ یادیں اور نقوش وابستہ ہو چکے ہیں جنہیں زمانہ بھلا نہ پائے گا۔

یہ دن جہاں ہماری پاکستانی قوم کے لئے بڑی آزمائش کا دن تھا وہاں پر پاکستان کی نڈر اور بہادر مسلح افواج کے لئے بھی انتہائی کڑا وقت تھا۔ اس روز پوری قوم اور فوج کے افسروں، جوانوں نے باہم مل کر سچے جذبے کے ساتھ بزدل اور مکار و عیار دشمن کے ناپاک اور

گھناؤنے عزائم کو خاک میں ملا دیا تھا۔ان فرزندان پاکستان کی بے مثال اور لازوال قربانیوں کی بدولت آج ہمیں تاریخ میں ایک باوقار مقام حاصل ہے۔اُس روز اس تاریخی جنگ میں سازوسامان اور عددی دونوں لحاظ سے اپنے سے دس گُنا بڑی طاقت کو ذلت آمیز پسپائی اور شکست پر مجبور کر کے پوری دنیا میں اس کا گھمنڈ اور تکبر خاک میں ملا دیا۔ ہماری مسلح افواج نے جرات اور ہمت سے کام لیتے ہوئے اور جانوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خطرات کا مقابلہ سینہ سپر ہو کر کیا۔

آج کے دن کی یاد مناتے ہوئے ہمیں اس تاریخی حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری قوم اور دشمن سے کہیں کم تعداد میں ہمارے شیر دل جوانوں اور دلیر مجاہدوں نے جن میں غازی اور شہید دونوں شامل ہیں جو کارنامے سرانجام دیئے وہ ان کی جرات،قربانی،عزم اور ان کے جذبے کی عکاس ہی نہیں ہماری جنگی تاریخ کا ایک زریں باب بھی ہیں۔ہم ہر سال اس تاریخی دن کی یاد کیوں مناتے ہیں؟اس لیئے تاکہ قومی یکجہتی کے اس زبردست مظاہرے اور جرات و عظمتوں کے درخشندہ کارناموں کی یاد تازہ کی جائے۔اگر چہ ان حالات میں مشکلات کا سامنا تھا تاہم 6 ستمبر کا دن ہماری قومی اور عسکری تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ثابت ہوا۔ ہماری بہادر بری،،بحری اور فضائی افواج کی پشت پر پوری قوم یک جان ہو کر دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن گئی دنیا نے ہماری قوم کے نا قابل تسخیر جذبے اور مسلح افواج کی شاندار کامیابیوں کو تسلیم کرتے ہوئے ہمارے شیر دل جوانوں اور شاہین صفت ہوا بازوں کے جذبہ جہاد اور ایمانی قوت کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔

6 ستمبر کی یاد مناتے ہوئے جب ہمارا ذہن اس تاریخی معرکہ کی ورق گردانی کرنے لگتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح ہمارے بزدل، مکار اور عیار دشمن نے اپنی روایتی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں وطن عزیز کی مقدس اور پاک سرحدوں کے تقدس کو روندتے ہوئے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ بین الاقوامی سرحد کی اس طرح کھلم کھلا خلاف ورزی کا کسی

طور تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔لیکن ہمیں جس عیار اور بزدل قوم سے پالا پڑا ہے اصولوں کی پامالی اس کی سرشت میں شامل ہے۔ ہماری بیدار و زندہ قوم نے قومی یکجہتی کا بے مثال مظاہرہ کر کے دشمن کے ناپاک اور مذموم عزائم کو خاک میں ملا دیا۔لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ورد کرتی ہوئی پاکستان کی مسلح افواج نے بھارت کی جارحیت اور کفر کے غرور کا سر کچل کر رکھ دیا۔

6 ستمبر کا تاریخی دن اپنے جلو میں اپنی جوانمٹ یادیں اور نقوش چھوڑ گیا ان کو یاد کر کے ہماری دلیر مسلح افواج اور قوم کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔6 ستمبر 1965 کو بھارت کے جنگی ناخداؤں کو شاید یہ لگا کہ پاکستان ایک تر نوالہ ہے۔6 ستمبر کو جو کچھ ہوا اس نے بھارت کے حکمرانوں کو ان کے خواب سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اسی شام تک لاہور پر قبضہ کرنے کی بجائے انہیں اپنی مسلط کردہ جنگ باقی مدت لاہور سے دور اپنی سرزمین پر لڑنی پڑی جس میں ان کے قدم ایک انچ آگے نہ بڑھ سکے۔لاہور داتاؒ کی نگری اور میاں میرؒ کا شہر ہے۔جس کو فتح کرنے کا مکروہ خواب ہندوستان نے دیکھا تھا اس شہر کی فضاؤں میں توپوں کی گھن گرج کی آوازیں بیچ شہر تک سنی جا رہی تھی لیکن ہر شخص خود حفاظتی تدابیروں سے بے نیاز سرحد کی طرف جانے کے لئے بے چین تھا۔نہ اس کو دفاع کے لئے خندقیں کھودنے کا خیال تھا نہ آسمان سے گولے گرنے کا خوف۔وہ تو آسمان پر لڑتے ہوئے اپنے جہازوں کو دادِ شجاعت دے رہے تھے اور کسی بھی طرح سرحدوں پر فوجی جوانوں کے ساتھ شریکِ جہاد ہونا چاہتے تھے 6 ستمبر کو بھارتی فوج سات مقامات سے پاکستان پر حملہ آور ہوئی تھی۔سیالکوٹ واہگہ، برکی۔قصور، کھیم کرن اور سلیمان کی یہ سات محاذ درہ حاجی پیر، پیر صحابہ اور کشمیر میں دوسرے مقامات کے علاوہ تھے۔اس کا مقصد پاکستان کو گھیر لینا اور اس کی شہ رگ کو کاٹ دینا تھا۔

6 ستمبر کا معرکہ حق و باطل صرف دو قوموں کی جنگ یا روایتی معاشی لڑائی نہیں تھی۔ یہ درحقیقت دو نظریات کا خون ریز تصادم تھا۔عالم کفر اپنی تمام حشر سامانیوں اور دنیاوی اسباب سے مکمل لیس اور عالمی سامراجی گماشتوں کی پس پردہ سپورٹ اور تعاون کے ساتھ میدان جنگ

میں اترا تھا۔ دوسری جانب اسباب میں کمزور مگر جذبہ جہاد سے سرشار اور نظریہ پر مر مٹنے والی فوج اور عوام خالص ایمانی طاقت کے بل بوتے پر میدان کارزار میں اتری۔ دنیا نے دیکھا کہ نظریہ ایمانی نے مالی اسباب اور طاقت کو پاؤں کی ٹھوکر پر رکھا اور طاقت کے جنون میں مبتلا دشمن کو زمین بوس کر دیا۔ اس دن پاکستان کے اندر رہنے والے کروڑوں افراد قوم بن گئے جن کا نسب العین مادر وطن کے ایک ایک انچ کی حفاظت کرنا تھا۔ جب عوام قوم بنی تب دنیا کے منظر نامے وہ نقوش ابھرے جن کی مثال رہتی دنیا تک دی جاتی رہے گی۔ انسانوں نے جسموں سے بم یوں لپیٹ لئے جیسے سہاگن شادی کا جوڑا سینے سے بھینچ لیتی ہے۔ اس دن کی عظمت بلندی رفعت اس قوم کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گی کیونکہ زندہ قومیں اپنے ماضی کو یاد رکھا کرتی ہیں۔ تا کہ روشن مستقبل کی جانب سفر کر سکیں۔

پاک فوج زندہ آباد پاکستان زندہ آباد

☆☆☆

کچھ خوبیاں جو کامیاب بنائیں

سائیکالوجی ہمیں کامیابی کے بارے میں یہ بتاتی ہے کہ پچانوے فیصد جو چیزیں ہم سوچتے ہیں، محسوس کرتے ہیں ان پر ایکشنز لیتے ہیں اور حاصل کر پاتے ہیں ان سب کے پیچھے محنت سے زیادہ کردار ہماری خوبیوں کا ہوتا ہے۔ ہماری خوبیاں ہی ہمارے لئے وہ عناصر پیدا کرتی ہیں جن کی بدولت یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ ہم کامیاب ہونگے یا ناکام۔

دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت کم لوگ کامیاب ہو پاتے ہیں کیونکہ بہت کم افراد ہی اپنی خوبیوں کو پہچان پاتے ہیں اور ان سے نئے عناصر پیدا کر پانے کے بعد ان پر عمل کرتے ہیں۔ ایک قابل غور بات یہ ہے کہ عناصر، کام اور خوبیوں کو صرف ان کی حد تک انکے معنی جانتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں گے تو یہ ہمیں تسلسل قائم رکھنے میں زیادہ مدد نہ دے پائے گا ہمیں ان سب کو رسومات کے طور پر لینا ہوگا اور آگے بڑھنا ہوگا۔ جو بدلے میں کامیاب بنا دیتی ہیں۔

کچھ خوبیوں کا ذکر کر لیتے ہیں جو ہماری کامیابی کا باعث بن سکتی ہیں۔ سب سے پہلے بات کر لیتے ہیں High Self Concept کی۔ لوگوں کی مثبت باتوں کو حقیقت سمجھ لینا، ہمارا ذاتی خیال بدل دیتا ہے۔ ہمارے اندر منفی رویوں کو نکالنے کے لئے مثبت عوامل، رویے اور لوگوں کی حوصلہ افزئی از حد ضروری ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک بچہ کسی دکان پر جاتا ہے اور دکاندار اسے کہتا ہے کہ دیکھو بیٹا تمہارا مستقبل بہت اچھا ہے تم بہت قابل معلوم ہوتے ہو۔ تم اپنی زندگی میں کوئی بڑا مقام ضرور پاؤ گے۔ تو صرف اتنا کہنا ہی اس بچے کے اندر وہ جذبہ پیدا کر گیا

جو اسے آگے بڑھنے کا نیا حوصلہ عطا کرے گا۔ وہ بچہ اسی وقت ان باتوں کو ذہن نشین کر لیتا ہے اور مثبت سوچ کے ساتھ گھر کو آتا ہے اور یہی سوچتا کہ میں ایک بڑا آدمی بنوں گا۔دکاندار کی بات سے بچہ بچہ اپنی موٹیویشن کے لئے مثبت معنی نکال کر ان پر عمل پیرا ہو کر آگے بڑھتا ہے اور آخر کار کامیابی پا بھی لیتا ہے۔

مثبت اور منفی کردار ہماری زندگی میں آتے جاتے رہتے ہیں اور ہم ان کو دیکھ کر سیکھتے رہتے ہیں اور ان دونوں کا ہی اثر کبھی کبھی ہم پر زندگی بھر بھی رہ جاتا ہے۔ہم زندگی میں اتنی ہی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں جتنا ہم نے اپنا ذاتی خیال بنایا ہوگا۔مثال کے طور پر پیسوں کے حوالے سے ہمارا ذاتی خیال اگر یہ ہے کہ میں مہینے کا بیس ہزار ہی کما سکتا ہوں اس سے زیادہ نہیں تو حقیقت میں بھی ایسا ہی ہوگا۔دوسری جانب اگر ہمیں اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑ جاتا ہے تو کہیں اور ہمیں نوکری مل جاتی ہے مگر اس وقت ہمیں کم پیسوں میں کام کرنا پڑتا ہے تو تب کیا ہوگا ہم اس وقت اپنا دماغ زیادہ چلائیں گے اور زیادہ کا سوچیں گے زیادہ کی اُمید لگائیں گے اور زیادہ محنت کریں گے جب ہم ایسا کریں گے تو ہی ہم زیادہ پیسے بھی کما پائیں گے۔

ہمارا مستقبل ہماری سوچ پر منحصر ہے۔ایک لڑکا تقریر کے لئے چنا جائے مگر اس کا ذاتی خیال ہے کہ میں اچھا بول تو لیتا ہوں مگر سٹیج پر جا کر میں اچھا نہیں بول پاؤں گا وہاں جا کر میں لڑکھڑا جاؤں گا تو جان لیجیئے حقیقت وہی ہوگی جو ہم سوچتے ہیں اور ایسا تب تک چلتا رہے گا جب تک وہ لڑکا یہ سوچنا نہیں چھوڑ دیتا کہ میں سٹیج پر جا کر نہیں بول پاؤں گا۔ہمارا ذاتی خیال ہماری کامیابی کے آڑے آسکتا ہے۔اسی لئے سوچ مثبت رکھنی چاہیئے۔

اب بات کر لیتے ہیں نظم وظبط کی۔

بچے فلمیں دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ڈسپلن انسان کو bore کر دیتا ہے۔مگر دنیا کے کامیاب لوگ نظم وظبط کا بہت خیال رکھتے ہیں اور یہی انکی وجہِ کامیابی ہوتی ہے۔نظم وضبط ہماری ایسی قابلیت ہے جو کام کرنے کے لئے ضروری ہے اور وہ بھی صحیح وقت پر، پھر چاہے وہ کام کرنے

کے لئے ہمارا ذرا بھی دل کرے یا نہ کرے۔اس بات سے فرق نہیں پڑتا۔اگر ہم یہ سوچ لیں کہ کل صبح چھ بجے اٹھنا ہے تو یہ سب کرنے کے لئے ہمیں موٹیویشن سے زیادہ نظم وضبط کی ضرورت ہوگی۔کیونکہ موٹیویشن سے ہم ایسا ایک دن،دو دن یا شاید ہفتہ کر پائیں۔اگر ہم اسے عادت بنا لیں تو ایسا کرنا آسان ہو جائے گا جس کی وجہ سے ہماری خوداعتمادی بھی بہت بڑھ جائے گی۔ کیونکہ نظم وظبط خوداعتمادی بڑھانے کے لئے بہت کام کرتا ہے۔اب ان پر عمل کرنا ہمارا کام ہے کامیاب لوگوں کی ایک خاصیت یہ ہوتی ہے وہ اپنا کام وقت پر ختم کر کے آگے بڑھتے ہیں۔

جسمانی غذا کے علاوہ ہمارے دماغ کو بھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے اسے روزانہ کچھ نیا سنا کر اسکی غذا کا خیال رکھیں ہمارے دماغ میں پوزیٹیویٹی بھرتے رہنا خود کو کسی قابل بنانا ہے۔اس طرح ہمارا دماغ ہمیں نئے راہ دیکھائے گا کچھ تجاویز دے گا۔یاد رہے منفی معلومات سے اپنے دماغ کو دور رکھا جائے جو کہ ہمارا میڈیا آجکل دیتا ہے۔کچھ چیزیں کچھ ہی مقدار میں اچھی لگتی ہیں زیادہ مقدار ہمارے لئے نقصان کا باعث بن سکتی ہیں۔روزانہ کی بنیاد پر مقصد کو طے کر لینا بہت عمدہ اور کارآمد عمل ہے۔مثال کے طور پر ہماری زندگی اگر سولر سسٹم ہے تو سورج ہمارا Time Management ہے جس کے گرد ہمارے کام گھومتے ہیں۔ہماری فیملی، پیسہ، پیار،مزہ اور صحت وغیرہ۔اگر وقت کو ترتیب دینا سیکھ جائیں تو ہمارے مقاصد آسانی سے پورے ہو پائیں گے۔

کامیاب لوگ اپنے کام کے ساتھ ساتھ خود پر بھی توجہ دیتے ہیں۔خود کا خیال رکھنا یعنی اپنے مستقبل اور کامیابی کا خیال رکھنا ہے۔ڈاکٹر کے کلینک کے چکر کاٹنے سے اچھا ہے کہ اپنا خیال رکھا جائے۔کیونکہ جو ہم پیسہ کماتے ہیں وہ دوا میں لگ جاتا ہے اور وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔پھر یہ چلتا رہتا ہے۔انسان جتنی محنت کام پر کرے اس سے کئی زیادہ محنت اور خیال اپنی صحت کا رکھے کیونکہ آپ جتنے مرضی بڑے گھر میں رہ لیں جتنا مرضی پیسہ کما لیں جتنی مرضی بڑی گاڑیاں رکھ لیں لیکن اگر صحت نہیں تو کچھ نہیں۔

تنگدستی گر نا ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

کامیابی انسان کے اندر اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں چھپی ہوتی ہے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ انسان کب اس کو پہچان کر باہر نکال پاتا ہے۔انسان کا مثبت ذہنیت کے ساتھ مکمل سوچ و بچار کے ساتھ کسی مقصد کو حصول زندگی بنالینا اس کی کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔انسان کامیابی کے نہیں بلکہ کامیابی انسان کے پیچھے بھاگتی ہے بس ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ انسان خود کو جان سکے اور یہ راز پاسکے کہ اصل میں انسان کی کامیابی ہے کیا۔

☆☆☆

زندگی میں حصولِ کامیابی کے گُر

کامیاب انسان کون نہیں بننا چاہتا؟ بتا تا چلوں کہ آپ میری اس تحریر میں اُن پوائنٹس سے آگاہ ہو جائینگے جنہیں ذہن نشین کرنے سے کامیابی کا حصول ممکن ہے۔ ذہن نشین کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہوگا۔ بات آگے بڑھاتے ہوئے بتا تا ہوں کامیابی کو پیسوں سے نہیں خوشی سے ناپنا چاہیے۔ لوگ پیسہ حاصل کرنے کے لیے محنت کرنا شروع کرتے ہیں جب انہیں پیسہ مل جاتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک کامیاب انسان ہیں جو کہ بلکل غلط ہے۔

جس انسان کے پاس پیسہ آئے گا تو لالچ اس کے اندر گھر کر لے گی اور وہ لالچ کا شکار ہوتا چلا جائے گا۔ جو انسان خوشی کو اپنی کامیابی سمجھتا ہے تو اصل میں وہ انسان کامیاب ہے۔ جب انسان پیسہ کماتا ہے تو اس کے اندر جو لالچ آتی ہے تو بظاہر وہ انسان خوش ہوگا لیکن اندر سے بہت سے مسائل ہونگے۔ جو کہ اسکے ناخوش رہنے کی وجہ بنتے ہونگے۔ آگے کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ خود کو چیلنج کریں جو انسان خود کو چیلنج نہیں کرسکتا خود کو چیلنج کرنے کا ہنر نہیں رکھتا تو کامیابی اس سے کوسوں دور رہتی ہے آپ اگر کوئی کام کرنا چاہتے اس میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو خود کو چیلنج کرنا ہوگا دوسروں سے بہت پہلے ایک معرکہ انسان کو خود سے لڑنا پڑتا ہے۔ اگر انسان اندر کی لڑائی جیت جائے تو اسکو آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

کامیابی کے حصول کے لئے انسان کو جھوٹی انا کی غلامی سے آزاد ہونا پڑتا ہے۔ محنتی اور خودداری کے راستے کا چناو کرنے والا فرد سب سے پہلے اپنے اندر کے تمام جھوٹے بت گراتا

ہے۔

ہر وہ انسان جو ذہین ہے اور اپنی راہ بنانا چاہتا ہے اسکو کئی قسم کے نشتروں سے گزرنا پڑتا ہے۔تبھی وہ نکھر پاتا ہے۔سب سے پہلا نشتر تنقید ہوتی ہے۔جو بسا اوقات مثبت سے زیادہ منفی ہوتی ہے۔مگر ذہین انسان منفی تنقید پر کان نہیں دھرتا اور مثبت تنقید سے سیکھنے کی سعی کرتا ہے۔ انسان کے کام کے دوران اس کے تخلیقی کام کی خوبی کو اجاگر کیا جاتا اور کمزوریوں کی نشاندہی کی جاتی ہے تا کہ اس کے ہنر سے کمی کوتاہی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی چلی جائے آپ کچھ لوگ تنقید کے آپکو سبق دیتے ہیں جس سے آپ مزید آگے بڑھتے ہیں مگر وہیں کچھ لوگ اس منفی ذہنیت کا استعمال کر کے آپکو گرانا چاہتے ہیں۔لیکن آپ کا ذہن مثبت رہنا چاہیے تا کہ مایوسی آپ کے پاس نہ آئے اور منفی ذہنیت کے حامل افراد ہار تھک کر بیٹھ جائیں۔

جب ہم اس pin point کو مدِنظر رکھیں گے تو انشااللہ کامیابی دور نہ ہوگی۔دوستو اپنی غلطیوں سے سیکھا جائے جب تک انسان اپنی غلطیوں سے سیکھنا شروع نہیں کرے گا وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔

انسان جب ایک غلطی کرتا ہے تو کوشش کرتا ہے دوبارہ نا ہو مگر جب دوبارہ کوشش کے باوجود وہ پھر غلطی کرتا ہے تو پھر ایسا نقطہ ڈھونڈنے لگ جاتا ہے کہ غلطی کس وجہ سے ہو رہی ہے تو وہ پھر اسے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اصل میں کامیابی یہی ہے کہ ہر دفعہ نئے جذبے کے ساتھ آگے بڑھا جائے انسان جب آگے بڑھتا ہے تو مثبت ہونا لازم ہے۔ہر انسان کے ساتھ پوزیٹیو رویہ رکھنا ہوگا ہر کام مثبت طریقے سے کریں اگر کوئی آپ سے سوال پوچھتا ہے تو آپ اُسکا جواب منفیت سے نہ دیں۔اسکا آپکی شخصیت پر بہت برا اثر پڑ سکتا ہے۔چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑا مسئلہ نہ بنائیں۔

آپ کا منفی رویہ آپ کی کامیابی کے آڑے آسکتا ہے۔کسی کے بارے میں غلط نہ سوچا جائے۔اگر غلط خیال ذہن میں پنپنے تو اسکو فوری نکال دینا چاہیے کیوں کہ چھوٹے ذہن کا

انسان اگر وقتی طور پر کامیاب ہو بھی جائے، وہ ایک دن گر ہی جاتا ہے۔اگر انسان خود کو مشکل گھڑی میں غلط فیصلے سے روک لے تو ایک دن اس کی کامیابی چل کر اس کے پاس آتی ہے۔ دوسرا درست راستے کا انتخاب کرنے سے اندر اندھیرا کم ہوتا چلا جاتا ہے اور روشنیاں بیدار ہونے لگتی ہیں اس سے آئندہ کے لئے غلطی کا امکان کم ہو جاتا ہے۔جو انسان ایک دفعہ خود کو غلط سے روک سکتا ہے وہ بار بار روک سکتا ہے۔یہ حوصلہ اس کے اندر طاقت عطا کرتا ہے۔یوں انسان خود سے کلام کرتا ہے کہ اگر میں خود کو ایک بار روک سکتا ہوں اسکا مطلب میں ہر غلط قدم سے بچ سکتا ہوں۔

کامیابی کا نشہ کامیاب انسان کو بھی کمزور بنا دیتا ہے اس لئے کبھی بھی وقتی یا عارضی کامیابی کے بعد یہ مت سمجھیں کہ اب ہر مشکل آسان ہوگئی ہے۔ بلکہ یاد رکھیں اب تو مقابلہ شروع ہونے جا رہا ہے اور آپ کا مصمم ارادہ اور نیک نیتی ہی آپکو آگے سرخرو کرے گی۔کبھی بھی اپنے آپ سے اپنی کامیابی سے مطمئین نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جب ایک انسان کامیابی حاصل کر لیتا ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ میں ایک کامیاب انسان بن چکا ہوں تو وہ غلط سوچ رہا ہوتا ہے۔

کیونکہ مکمل کوئی بھی نہیں ہوتا جتنی محنت کی جائے اسے کم سمجھنا چاہیے اور زیادہ محنت کر کے زیادہ کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر کہیں پر آپ ناکام ہوتے ہیں تو آپ کو ناکامی سے حاصل کئے گئے اسباق پڑھ کر کامیابی کے ڈگر پر واپس جانا ہے۔آپ کو رکنا نہیں ہے بلکہ سفر جاری رکھنا ہے۔تا کہ کامیابی آپ کا مقدر بنے۔

اللہ کے علاوہ کسی کا ڈر دل میں نہ رکھیں آپ جب کسی سے خوفزدہ رہتے ہیں یا کسی ڈر میں رہتے ہیں تو آپ سے کام نہیں ہوتا دماغ کہیں اور چلا جاتا ہے۔لوگ کیا سوچیں گے یہ سب دماغ سے نکالنا ہوگا۔

we should join the company of positive people اگر ہمارا سرکل پوزیٹیو لوگوں سے بھرا پڑا ہے تو یقین جانیے ہم پہلے سے ہی کامیاب انسان ہیں کیونکہ ہم نے

ایک ایسی صحبت میں آ کر کامیابی حاصل کر لی جو مثبت رویوں اور سوچوں سے بھری پڑی ہے۔اور یاد رکھیے مثبت لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں وہ آپکو مثبت کاموں میں مصروف کر دینگے تو اپنیسر کل میں ان لوگوں کا ہونا ضروری ہے جو مثبت سوچ رکھتے ہیں۔

آخر میں اتنا کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے اسی لئے قربانی بھی ضروری ہے۔

کامیابی کا سفر انسان کو آہستہ مگر مستقل مزاجی سے طے کرنا پڑتا ہے۔ اس سفر کا راستہ دور سے آسان مگر حقیقت میں بہت مشکل پر خطر ہوتا ہے۔ راہ میں ہزاروں لاکھوں مسائل منہ کھولے کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر دفعہ انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ اب آگے کیا ہوگا۔کیا کامیابی ممکن ہو سکے گی۔کیا صاف ذہنیت کا مقدرت کامیابی ہے بھی یا نہیں، بہت سے سوال ذہن میں آئیں گے۔راستے سے پلٹنے کے کئی بہانے ملیں گے۔کئی جعلی آسان فریب نظر آئیں گے۔انسان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگا۔بہت سے ایسے زخم ملیں گے جس سے اس کا وجود کرچی کرچی ہو جائے گا۔اسے ایسا لگے گا جیسے یہ سفر اس کو چاٹ جائے گا مگر یہ وہم ہوگا بس بھرم ہوگا۔جو انسان سنگلاخ راستوں پر امید کا دامن یقین کی طاقت سچ کا پلو تھام کر مضبوط اعصاب کے ساتھ ڈٹ جائے گا کامیابی اس کے پیروں کی دھول ہوگی۔اس کو وہ کچھ حاصل ہوگا جس کا تصور بھی دور سے دیکھنے والے نہیں کر سکتے۔مگر کامیابی کے لئے آزمائش شرط ہے اور امید طاقت۔

☆☆☆

روزگار ہستی ڈاکٹر رفیق احمدؒ

یہ سن 1946 کی بات ہے۔اسلامیہ کالج گراؤنڈ میں تقریب تقسیم انعامات جاری تھی یہ دل فریب تقریب ایک بڑے خیمے میں منعقد ہوئی تھی۔ اس تقریب کے روح رواں قائداعظم محمّد علی جناحؒ اسٹیج پر رونق افروز تھے تمام انعام یافتہ طالبعلم اسٹیج پر جا کر اپنے عظیم قائد سے انعام وصول کر رہے تھے۔ قائداعظمؒ کی دلکش اور سحر انگیز شخصیت کی ایک جھلک پانے کی کوشش میں تمام طلباء بے تاب ہوئے جا رہے تھے۔

قائداعظم کو کرشماتی شخصیت کا اثر تھا جس کی وجہ سے بعض طالبعلم سیڑھیاں چڑھتے پھسل گئے۔ اپنے لیڈر کی محبت میں اس دن پھسلنے والوں میں، میں بھی شامل تھا۔ جب میں لکڑی کی سیڑھیوں سے پھسلا تب قائداعظم محمد علی جناحؒ نے مجھ سے کہا:

"you have to getup yourself, nobody is going to pick you up."

میں نے اسے اپنے اور قوم کے لئے ایک پیغام سمجھا۔ مجھے اپنے قائد سے دو کتابیں ملی تھی۔ یہ الفاظ ڈاکٹر رفیق احمدؒ صاحب ادا کر رہے تھے تو ہم نوجوان ان کو بس دیکھتے چلے جا رہے تھے.

ڈاکٹر رفیق احمد صاحبؒ تحریک پاکستان کے کارکن، پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور نظریہ پاکستان ٹرسٹ کے وائس چیئرمین اور ہم نوجوانوں کے رہنما تھے،انکی ہم نوجوانوں کو کی گئی نصیحتیں ہمارے مستقبل کے راستوں کے تعین کا بہترین وسیلہ ہیں. ہم ان کے دکھائے اور بتائے ہوئے راستوں پر چلنا باعث سعادت سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحبؒ جیسی ہمہ جہت اور باکمال شخصیت 25 مارچ 2020ء کو ہم سب چاہنے والوں کوغم زدہ اور سوگوار چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی. ڈاکٹر رفیق احمدؒ پنجاب کے ساتھ ساتھ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے بھی سابق وائس چانسلر تھے۔ وہ برصغیر کی تقسیم کے وقت اسلامیہ کالج لاہور میں بیچلرز کے طالب علم تھے اور تحریک پاکستان کے کارکن کی حیثیت سے تحریک کا ہراول دستہ تھے۔ انہوں نے ایک بار بتایا کہ جب وہ نویں جماعت میں تھے ،تو اس وقت انہوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر "لے کے رہیں گے پاکستان، قائداعظم زندہ باد" کے نعرے لگائے۔

پاکستان اور نظریہ پاکستان سے عشق وجنون کی حد تک لگاؤ رکھنے والی اس عظیم اور بے لوث شخصیت سے میرا باقاعدہ تعلق نظریہ پاکستان سمر سکول میں ہو۔ یہ سن 2011ء کی بات ہے، بچوں میں کچھ کرنے کی لگن تب ہی پیدا ہوتی ہے جب ان کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا جائے ان کو ان کی جڑوں کی حقیقی پہچان کروائی جائے۔

ڈاکٹر صاحبؒ بچوں کو سراہنا انکو آگے بڑھنے کا حوصلہ دینے کا ہنر جانتے تھے. سمر سکول کا پہلا ہی دن تھا مہمانانِ گرامی قدر سٹیج پر تشریف فرما تھے تب اچانک ڈاکٹر صاحبؒ اُٹھ کر بچوں میں تشریف لے آئے اور اقبال کے اشعار سننا شروع کر دیے۔ انکا ہم بچوں کو اقبال کے شاہین کہنا سب سے زیادہ بھاتا تھا۔ جب باری میری آئی مجھے ڈر اور انکی بارعب شخصیت نے آن گھیرا میں بس ڈاکٹر صاحبؒ کو دیکھتا رہا جو سکون میں نے ان لمحات میں محسوس کیا وہ لفظوں کے بیان سے بہت بلند تھا۔

مجھ سے کہنے لگے کبھی کسی ایکٹیویٹی میں حصہ لیا ہے میں نے کہا جی سر، پھر مجھ سے اسی میٹھے لہجے سے سوال کیا کہ بیٹا اقبالؒ کے شاہین ہو؟ میں نے مثبت جواب دیتے ہوئے ان کو اقبالؒ کا وہ شعر سنایا جو میرے بابا جان نے مجھے دوسری جماعت میں یاد کروایا تھا۔ جب شعر ختم ہوا تو ڈاکٹر صاحب کے کہے گئے الفاظ میرے لئے کسی سند سے کم نہ تھے کہ "اقبالؒ کے شاہین

نے اقبالؒ کا شعر سنایا ہے "۔وہ دن میرا مجھ سے عہد کا دن تھا کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے الفاظ کی لاج رکھتے ہوئے فکری طور پر اقبالؒ کا سچا شاہین بننا ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے ساتھ کیا گیا Think Tank کوئی نہ بھلا پائے گا۔ ڈاکٹر صاحبؒ بچوں کی رہنمائی کے لئے انہیں ایک میٹنگ کے طور پر پاس بلایا کرتے تھے جس میں ہم سب جوش وخروش کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیتے اور سوالات بھی کرتے۔ڈاکٹر صاحب ؒ معمول کی باتوں کے دوران بچوں کو مسلمانوں کی درخشاں تاریخ سے بھی آگاہ کیا کرتے۔ہمیں کسی قسم کی پریشانی ہوتی تو ڈاکٹر صاحبؒ کے آفس جاتے ان سے ان کا قیمتی وقت لیتے۔وہ بڑے پیارے بزرگانہ انداز سے ہمیں سمجھاتے۔ان سے بات کر کے ہم پر علم کے دروازے بھی کھلتے اور ہم روحانی سکون بھی حاصل کیا کرتے . غیر محسوس انداز میں بچوں کی تربیت ہو جاتی۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی شخصیت سے ہم اتنا متاثر اس لئے ہوئے کیونکہ ان کی شخصیت ہی ایسی لاجواب اور باکمال تھی کہ انہیں دیکھتے اور ان کی باتیں سن کر انسان اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا. ان سے مل کر ہم علم سے عمل کی راہ پر چلنے لگے۔

افسوس آج ہم میں ہمارا رہبر اور نظریہ پاکستان کی فکر کا امین نہیں رہا مگر ان کا سکھایا حرف حرف نوجوانوں کے دلوں میں زندہ ہے. وہ اپنی آخری سانس تک اپنے مقصد کے ساتھ مخلص رہے. قائداعظمؒ کا یہ سچا سپاہی قائد کے قول کام کام اور کام کی عملی اور چلتی پھرتی تعبیر تھا اور یہی پیغام ڈاکٹر صاحب ؒ ہم کو دے گئے۔

ڈاکٹر رفیق صاحبؒ ایک عظیم استاد اور منتظم تھے۔مختلف تعلیمی اداروں میں ان کی خدمات کو سنہری الفاظ میں ہمیشہ یاد رکھا جانا چاہیے ڈاکٹر رفیق احمد صاحبؒ کے انتقال سے جو خلا باقی ہے وہ پورا نہیں ہو سکے گا۔مگر انکی فکر اور فلسفہ کو اپنا کر ہم ان کے دیئے درس پر عمل پیرا ہو کر اقبال کے سچے شاہین اور نظریہ پاکستان کے امین بن سکتے ہیں یہی ڈاکٹر صاحبؒ کی سوچ مقصد اور خواہش تھی۔

صبر نعمت خداوندی

صبر رکھو اللہ سب بہتر کرے گا، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور صابر انسان اللہ کو بے حد پسند ہے ایسے جملے تو ہم بہت سنتے ہیں مگر یہ صبر ہے کیا؟ اسکا ہماری زندگی میں کیا کردار ہے کیا یہ ایک مثبت عمل کے ساتھ ساتھ منفی حیثیت بھی رکھتا ہے؟ ہماری سوچ صبر کو کن معنوں میں سمجھتی ہے اور اس کے اصل معنی کیا ہیں یہ جاننا صبر کرنے کے لئے بہت زیادہ ضروری ہے۔عربی زبان کے اس لفظ کو اگر ہم قرآن مجید اور عربی ادب کی رو سے دیکھیں تو اس کے بنیادی معنی 'رکے رہنے' یا 'روکنے' کے ہیں۔ پھر یہ لفظ وسعت پا کر ''ثابت قدمی'' اور ''استقامت'' کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور اب یہ زیادہ تر اِسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ ثابت قدمی اپنے "موقف" پر ہوتی ہے۔ یہ "موقف" میدان جنگ بھی ہوسکتا ہے اور اعلیٰ اوصاف و اخلاق بھی۔یعنی آدمی ہر حالت میں اپنے اچھے "موقف" پر ڈٹا رہے تو یہ صبر ہے۔صبر میں غلط چیزوں پر ڈٹے رہنے کا مفہوم داخل نہیں ہے۔

اس لیے صبر کا لفظ ہمیشہ مثبت معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ تاہم اپنے حقیقی یا لغوی معنی (روکنے) میں یہ منفی پہلو میں بھی استعمال ہو جاتا ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ صبر مشکلات میں رونے دھونے اور چیخنے چلانے کے متضاد معنی میں بھی آتا ہے، لیکن بنظر غائر دیکھیں تو اس کے معنی بھی وہی ہیں۔یعنی رونا دھونا حوصلہ مندی جیسے اعلیٰ وصف پر قائم نہ رہنے کا نام ہے۔ چنانچہ جب ہم چیخنے چلانے والے سے یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ صبر کرو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حوصلہ مندی پر قائم رہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ عرب صبر کی جگہ 'تجمّل' کا لفظ بھی استعمال کر لیتے ہیں۔یعنی وہ رونے دھونے والے سے کہتے ہیں کہ 'تجمّل'' "بھلا کام کرو" یعنی صبر کرو اور کمزوری

ظاہر نہ ہونے دو وغیرہ, لوگوں کا بھلا کرنے لگو اور خود کو کسی بھی جگہ کمزور نہ پڑنے دو۔

لوگوں کی بھلائی کرنے پر بھی صبر آتا ہے۔آگے بڑھتے ہیں کہ اسی طرح بعد میں صبر کے ساتھ جمیل کا اضافہ ہونے لگا۔جس میں احسان اور نیکی کے معنی ہوتے ہیں۔اس طرح صبر جمیل ان مواقع پر استعمال ہونے لگا، جہاں صبر سے بڑھ کر مزید کسی حسن سلوک اور نیکی کی بھی ضرورت ہو۔جیسے قصہ یوسف میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال آئے اور آ کر ان سے جھوٹی کہانی کہہ سنائی تو انہوں نے جواب میں فرمایا:ایک طرف حضرت یوسف کے کھونے کا دکھ ہے اور دوسری طرف برادران یوسف کی دھوکا دہی کا غم وغصہ۔چنانچہ ایک طرف غم یوسف سے نبرد آزما ہونے کے لیے حوصلہ چاہیے اور دوسری طرف برادران یوسف سے عفو و درگزر کے لیے حوصلہ اور حسن سلوک۔

یہاں آپ کے سامنے صبر کا ایک اور رخ پیش کرتا چلوں کہ ابھی تک ہم نے صبر کے ساتھ مشکلات ہی کا ذکر کیا ہے کہ صبر مشکلات میں ثابت قدمی کا نام ہے،مگر جس طرح مشکلات میں صبر کرنا پڑتا ہے، ایسے ہی انعامات کے وقت بھی صبر کرنا پڑتا ہے۔یعنی جس طرح مشکل کی وجہ سے اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ آدمی اپنے موقف سے ہٹ جائے، اسی طرح نعمتیں بھی اس بات کا امکان پیدا کر دیتی ہیں کہ آدمی ان میں مگن ہو کر اپنے موقف سے ہٹ جائے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"اگر ہم انسان کو اپنے کسی فضل سے نوازتے ہیں، پھر اس سے اس کو محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس و ناشکرا بن جاتا ہے۔اور اگر کسی تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی اس کو نعمت سے نوازتے ہیں تو کہتا ہے کہ میری مشکلات رفع ہوئیں، پھر یہ ہوتا ہے کہ وہ اکڑنے والا اور شیخی بھگارنے والا بن جاتا ہے۔اس سے صرف وہی بچے رہتے ہیں، جو صبر کرنے والے اور نیک اعمال کرنے والے ہیں، انہی کے لیے بڑی نجات اور اجر کبیر ہے۔" یہاں قرآن مجید نے نعمتیں چھننے پر مایوس ہونے اور نعمتیں ملنے پر اکڑنے اور تکبر کرنے کو خلاف صبر رویہ قرار دیا ہے۔اس

سے مراد یہ ہے کہ صبر یہ بھی ہے کہ نعمتیں پا کر بھی آپے سے باہر نہ ہوا جائے.

یہ صرف چیخنے چلانے یا رائے میں حق پرستی کا نام نہیں ہے، بلکہ صبر یہ بھی ہے کہ آدمی مشکلات میں پڑنے کے بعد عملی طور پر بھی صحیح موقف پر قائم رہے۔اور یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ ہم سب امتحان میں ہیں کہ صبر کے اصل معنی یہ ہیں کہ ہر حالت میں علم و عمل میں صحیح "موقف" پر قائم رہیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صحیح "موقف" سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید نے سورۃ ملک کی پہلی آیات میں اس دنیا کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"بڑی ہی عظیم اور بافیض ہے، وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں (اس کائنات کی) بادشاہی ہے،اور جو ہر چیز پر قادر ہے۔اس نے زندگی اور موت کو پیدا کیا تا کہ تمہارا امتحان کرے کہ تم میں سے کون اچھے عمل والا بنتا ہے۔اور (اللہ) غالب بھی ہے اور مغفرت فرمانے والا بھی۔"

اس آیت سے ہمیں یہ بات واضح الفاظ میں معلوم ہو رہی ہے کہ ہمیں یہ زندگی اس لیے دی گئی ہے کہ ہمارا امتحان لیا جائے اور اچھے عمل والوں کو جنت کے لیے چن لیا جائے۔اس دنیا میں ہمارا اصل "موقف" یہی ہے۔یعنی ہم ہر لمحہ امتحان میں ہیں۔

اگر ہم کو کوئی نعمت ملے یا نہ ملے، جب کوئی آسانی آئے یا مشکل درپیش ہو تو ہر حالت میں یہ بات پوری طرح ملحوظ رہنی چاہیے کہ ہم امتحان میں ہیں۔جس شخص کو یہ حقیقت سمجھ میں آ جائے اور وہ اسی نقطہ نظر سے زندگی بسر کرنے لگ جائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا ہے کہ اللہ جس کی بھلائی چاہتا ہے، اسے دین کی یہ سمجھ عطا کر دیتا ہے۔

اس موقف کے واضح ہو جانے کے بعد ہماری پوری بات کا مطلب یہ ہے کہ صبر کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر حالت میں امتحان دینے والے بن کر رہیں۔

بطور مسلمان ہمارے لئے صبر اور شکر آپس میں جڑے ہوتے ہیں۔اس بات کو اس

طرح سمجھا جائے کہ اگر ایک انسان پر ایسی مصبت آ جائے جس کو حل کرنے پر وہ قادر ہی نہیں تو وہ ماسوائے صبر کے اور کر ہی کیا سکتا ہے۔مگر جب بات مسلمان کی آتی ہے تو ہم مصیبت میں گھرنے کے بعد بے شک اس مشکل کو حل نا بھی کر سکیں ہم تب اس حالت میں صبر کے ساتھ اللہ کا شکر بھی ادا کرتے ہیں۔کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ اللّہ کی ذات موجودہ مشکل سے مزید سخت امتحان بھی لے سکتی ہے۔اور اللّہ کی رضا میں اپنا عمل شامل کرنے کا طریقہ ابتلا کے وقت صبر کے شکر کرنا لازم ہے۔کیوں کہ اسی کے بعد انعام کا وعدہ ہے۔صبر ایک ایسی دولت ہے جو بنا ریاضت کے انسان کو حاصل نہیں ہوتی بسا اوقات سالوں کی محنت انسان کے ایک غلط اور کمزور بول کی نظر ہو جاتی ہے اس لئے دامن صبر کو تھام کر خود کو اللّہ پاک کو بارگاہ میں شکر کے ساتھ جھکا دینا چاہیے تاکہ آزمائش امتحان سے نعمت بن جائے۔

☆☆☆

حسد ایک سماجی بیماری

ہر کوئی اپنے لیے سکون تلاش کرتا ہے۔ اِس سکون کے لیے خود کو وہ بہت سے مراحل سے گزارتا ہے۔ لیکن اُس شخص کے متعلق ہم کیا کہیں گے جو خود کے لیے تکالیف کا سودا کر رہا ہو اور خوامخواہ اذیت پسندی کا شکار ہو۔ ایسے شخص کے متعلق ہم یہی خیال کریں گے کہ شاید وہ ذہنی طور پر تندرست نہیں ہے جو اذیتوں کا سوداگر ہے اُس کو اذیت دینا بھی اچھا لگتا ہے جی ہاں ایسا انسان وہ ہے جو کہ دوسرے سے حسد کرتا ہے۔ اور میں (پناہ مانگتا ہوں رب کی) حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔ حدیث کی رو سے حضرت عقبہ بن عامرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے اس کا ڈر بالکل نہیں ہے کہ تم میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے البتہ میں اس بات کا اندیشہ کرتا ہوں کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے دنیا کی آسائیشوں کے لیے حسد نہ کرنے لگو۔

ہر اخلاقی برائی نقصان دہ ہے کبھی یہ نقصان دنیا میں ہی نظر آ جاتا ہے اور کبھی آخرت تک موقوف ہو جاتا ہے۔ حسد یا جلن ایک ایسی بیماری ہے جس کا شکار آج کے دور میں بہت سے لوگ ہیں۔ حسد کا شکار نفسیاتی اذیت اٹھاتا ہے اور دل ہی دل میں گھٹ کر مختلف ذہنی و جسمانی امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یعنی حاسد کی سزا کا عمل اس دنیا ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں حسد کرنے والے کے شر سے اللہ کی پناہ مانگی گئی ہے کیونکہ وہ اس باؤلے پن کی وجہ سے ہر حد تک جا سکتا ہے۔ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے سوکھی لکڑی کو آگ۔ لہٰذا دنیا اور آخرت کی بھلائی کے لئے اس بیماری سے بچنے کے لیے تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے ضمرہ بن ثعلبہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ لوگ ہمیشہ بھلائی سے

رہیں گے جب تک وہ حسد سے بچتے رہیں گے۔

یہ تو ہمارے نبی کریم ﷺ نے فرمادیا مگر آج کا حال سب کے سامنے ہے۔ حسد کے لغوی معنٰی کسی دوسرے شخص کی نعمت یا خوبی کا زوال چاہنا اس کے نقصان کے در پے ہونا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص جب دیکھتا ہے کہ اس کے بھائی کہ پاس کار آ گئی ہے تو وہ آرزو کرتا ہے کہ کاش یہ کار اس سے چھن جائے یا اس کی کار کو کوئی نقصان پہنچایا جائے تا کہ اس کی راحت میں اضافہ ہو سکے۔ افسوس کہ آج کل یہ سچ ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو اور نہ حسد کرو اور نہ غیبت کرو اور اللہ پاک کے بندے اور بھائی بھائی ہو کر رہو اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ جُدا رہے۔

حسد جیسی قبیہہ بیماری اُس وقت پروان چڑھتی ہے جب اُس کے دو لوازمات پورے ہو جاتے ہیں سب سے پہلے کسی کی ترقی سے دل میں گھٹن محسوس ہونا اور ناخوش ہونا اور دوسرا یہ کہ اس کے نقصان کی تمنا کرنا یا نقصان ہو جانے پر خوش ہونا۔ ہر انسان کو خود کا جائزہ لینا چاہیے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اگر آپ کو دوسروں کی تکلیف پر خوشی اور ان کی کامیابی پر دکھ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ آپ اس کے نقصان کے متمنی اور اس کی نعمت چھننے کے منتظر ہیں تو جان لیں آپ ایک ایسی بیماری کا شکار ہو چکے ہیں جو آپ کو کھا جائے گی. اور آپ حسد کا شکار ہو کر ختم ہوتے چلے جائیں گے.

کچھ لوگ حسد اور رشک کو ایک ہی سمجھتے ہیں یاد رہے حسد اور رشک میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ حسد کے مفہوم میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ حسد میں کسی کی نعمت یا خوبی کا زوال چاہنا یا اس کے چھن جانے کہ خواہش کرنا ہے۔ جبکہ رشک میں کسی شخص کی خوبی سے متاثر ہونا اور اس جیسا بننے کی کوشش کرنا ہے۔ رشک میں وہ نعمت چھن جانے یا نقصان پہنچ جانے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ حسد اور رشک ایک جذبہ ہے اور پچھلی بات سے ثابت ہو رہا ہے کہ حسد ایک منفی جبکہ

رشک ایک مثبت جذبہ ہے۔

ابنِ مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبیﷺ کو فرماتے سنا کہ حسد (رشک) صرف دو چیزوں پر مستحسن ہے ایک وہ شخص جس کو اللہ پاک نے مال دیا اور اس کو راہ حق پر خرچ کرنے کی قدرت دی اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ پاک نے حکمت دی۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسولﷺ نے فرمایا کہ حسد (رشک) صرف دو شخصوں پر مستحسن ہے۔ ایک اس شخص پر جسے اللہ پاک نے قرآن دیا ہے اور وہ اسے دن رات پڑھتا ہے اور اس کا پڑوسی اسے سن کر کہتا ہے کہ کاش مجھے بھی اس کی طرح پڑھنا نصیب ہوتا تو میں بھی اس طرح عمل کرتا، دوسرے اس شخص پر جسے اللہ پاک نے دولت دی ہو اور وہ اسے راہ حق میں خرچ کرتا ہے۔ پھر کوئی اس پر رشک کرتے ہوئے کہے کہ کاش مجھے بھی یہ مال میسر آتا میں بھی اسے اسی طرح صرف کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دینی کاموں میں رشک کرنا ایک مستحسن عمل ہے۔ کیونکہ اس سے دینی میدان میں ترقی کی راہیں کھلتی ہیں۔ لیکن دنیاوی میدان میں بھی رشک کرنا کوئی ممنوع نہیں۔ مثال کہ طور پر ایک طالب علم دوسرے طالب علم کے اچھے نمبرز دیکھ کر رشک کرتا ہے اور جائز حدود میں رہتے ہوئے اس سے زیادہ نمبرز لینے کی کوشش کرتا تو یہ بھی ایک مستحسن عمل ہے۔ ہمارے معاشرے میں حسد بہت عام ہے غصہ، ڈپریشن احساس کمتری اور چڑ چڑاپن وغیرہ۔ سب سے بڑی بات حسد آخرت میں اللہ پاک کی ناراضگی کا موجب ہے۔

حسد انسان کو کئی طرح سے نقصان پہنچاتا ہے اسے مختلف انداز میں کنگال کرتا ہے. سب سے پہلے اچھے بھلے انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے . حاسد کے اندر کی گھٹن اسکو ذہنی بیماری کے ساتھ آہستہ آہستہ جسمانی طور پر بھی ختم کرنے لگتی ہے . ایسا انسان زندگی میں ہر مقصد ہر سوچ ہر ترقی کو بھول کر بس ایک ہی بات پر اٹک جاتا ہے . اس کے پاس ماسوائے نفرت کے کچھ بھی نہیں بچتا . بسا اوقات اس کی ذہنی کمزوری اس کے منفی جذبات اس کی غلیظ فطرت اس سے اس کے رشتے بھی چھین لیتی ہے کیوں کہ ایسے مزاج کا انسان اپنے سے

جڑے ہر رشتے میں نقص تلاش کرتا ہے۔اندر سے بیمار، ذہن سے کمزور اور عقل سے کوسوں دور حاسد سب کچھ ہار جاتا ہے۔یہی ایسی بیماری ہے جو انسان کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ اس لئے انسان کو اس منفی جذبے کو ہمیشہ دبا کر مثبت جذبات کو اپنے اندر جگہ دینی چاہیے اور قدرت کی تقسیم پر دل سے راضی اور شکرگزار ہونا چاہیے۔تاکہ وہ کسی ایسی ذہنی کشمکش سے دوچار نہ ہو جو اس کی تمام خوشیاں نگل لے۔

حسد نفرت کو اور نفرت حسد کو جنم دے سکتی ہے۔اللہ پاک ہمیں حسد سے بچائے۔ آمین۔

☆☆☆

غصہ عقل کا دشمن۔۔۔؟

غصہ آخر ہے کیا اسکا ہماری روزمرہ زندگی میں کیا اثر پڑتا ہے اور اسے ہم کنٹرول کیسے کر سکتے ہیں۔

سوچ کا یہ سفر غصے کو کہاں کہاں اور کیسا پاتا ہے دیکھ لیتے ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ غصہ ہمیں آتا نہیں ہے غصہ کیا جاتا ہے ایک مثال کے ساتھ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ اگر ہم کسی ادارے میں نوکری کر رہے ہیں اور وہاں ہمارے مالک نے آ کر ہم پر غصہ نکال دیا ڈانٹ ڈپٹ کے بعد وہ چلتے بنے اور ہم وہاں ہاتھ پر ہاتھ دھڑے بیٹھے رہے کیونکہ وہاں بولنا مطلب نوکری سے ہاتھ دھونا تھا اور دوسری جانب جب ہم گھر جاتے ہیں اور اپنے بچے یا چھوٹے بھائی کو کسی چھوٹی سی وجہ پر بھی ڈانٹ دیتے ہیں یا مار دیتے ہیں کیونکہ ہمارا ہم سے چھوٹے پر بس چلتا ہے اور اُمید ہوتی ہے کہ آگے سے جواب نہیں ملے گا اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہم غصہ کو کنٹرول بھی کر سکتے ہیں ہمارا ہمارے غصے پر پورا کنٹرول ہے جیسا کہ ہم اپنے مالک کے سامنے چُپ بیٹھے تھے کیونکہ نوکری کا خطرہ تھا تو ہم اپنے غصے کو کنٹرول کیے بیٹھے تھے اور گھر میں غصہ نکال دیا وہاں بھی اپنی مرضی سے غصہ کیا۔

غصہ ایک ایسی فیلینگ کا نام کا جس سے آج تک کوئی انسان بچ نہیں پایا اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں غصہ نہیں وہ غلطی پر ہیں۔ غصہ ایک ایسی بیماری ہے جو کہ ہماری صحت کے ساتھ ساتھ ہمارے رشتے ہمارے رویے اور ہمارے ماحول کو بھی خراب کر دیتی ہے ۔ غصہ ہی وہ واحد چیز جس کے کرنے کے بعد ہم پچھتاتے ہیں کہ کاش ہم نہ کرتے. یہی ہم سے غلط کام کرواتا اور پھر ہم سوچتے ہیں کہ کاش اس لمحے ہم اپنے غصے کو پی جاتے تو آج یہ نوبت نہ دیکھنا پڑتی کسی کا

خون نہ ہوتا کسی کا دل نہ دُکھتا مگر اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیا چُگ گئی کھیت ۔اس سے بڑی کیا بات ہو سکتی ہے کہ حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ تعالی علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی تجھے سب سے برا کہہ اور تجھے غصہ آجائے تو سمجھ لے کہ تو واقعی برا انسان ہے۔

غصے پر قابو پانا کون نہیں چاہتا ظاہر سی بات ہے ہر انسان اپنی اس بیماری سے پریشان ہوتا ہے وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ میں خود کو اس عذاب سے بچا لوں تا کہ زندگی سکون سے گزار پاؤں۔ غصے پر قابو پانے کا ایک ہی سادہ سا حل ہے اور وہ یہ کہ معاف کرنا سیکھا جائے۔ہم جب معاف کرنا شروع کردیں گے اور یہ سوچنا شروع کردے گے جو ہونا تھا وہ ہو چکا غصہ کرنے سے نقصان کا ازالہ نہ ہو پائے گا کسی کا دل ہی دکھے گا آپکی ہی شخصیت پر انگلی اُٹھے گی تو یہ سب ہمارے غصے کو قابو میں لانے کا آسان طریقہ ہے اگر ہم اپنے ہی الفاظ سے خود کو غلط کام کے لئے روک سکتے ہیں تو ہم غصے پر قابو پا سکتے ہیں۔

اگر ہمارا غصہ شدت پکڑ چکا ہے تو اسکو بھی قابو کرنے کا آسان سا حل ہے اور وہ یہ کہ ہم جس جگہ موجود ہیں وہاں سے کہیں دور چلے جائیں تا کہ ہم اپنے ابلتے ہوئے غصے کے باعث کسی کا نقصان نہ کردیں۔ سائنس کے مطابق ایک سے لے کر دس تک الٹی گنتی کرنے سے بھی غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ گہرے گہرے سانس لینے سے بھی غصے کی شدت کو کم کیا جا سکتا ہے۔

چیخنے چلانے ، مارنے ، جھگڑا کرنے سے تو بہتر یہی عوامل ہیں جن کے باعث ہماری شخصیت پر انگلی نہیں اُٹھے گی۔ جب ہم غصہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک جملہ بار بار دہرانا چاہیئے اور وہ یہ کہ غصہ کرنے سے اگلے کا نقصان ہو یا نہ ہو ہمارا نقصان لازمی ہوگا۔غصہ اس سلگتی ہوئی لکڑی کی طرح ہے جو دوسرے کو تو جلاتی ہے مگر سب سے پہلے خود جلتی ہے۔ جہاں غصے سے نقصان ہوتا ہے وہاں ہم اس سے فائدہ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔اسکا بہترین حل یہ ہے کہ ہم اپنے غصے کو اپنے کسی مشغلے میں لگا سکتے ہیں اپنے کسی جذبے میں لگا سکتے ہیں اپنے کسی کام میں لگا سکتے

ہیں۔اس عمل کی بدولت ایک تو ہمارا کام بھی ہو جائے گا اور دوسرا غصہ دور ہو جائے گا کیونکہ وہ ایک اچھے کام میں لگ چکا ہوگا۔غصہ بیماریوں کوجنم دیتا ہےاورسب سے بڑی بیماری ڈپریشن ہے جسکی وجہ سے دوائیاں کھانی پڑتی ہیں مسائل درپیش آتے ہیں۔زندگی سے خوشیاں دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔غصے پر جتنی جلدی قابو پا لیا جائے اتنا ہی ہماری صحت کے لئے فائدہ مند ہے۔

غصے کوعقل کا دشمن اورشعور کی موت کہا جاتا ہے. غور وفکر کیا جائے تو یہ بات سچ ہی ہے . ایسا جذبہ جوانسان کےحواس پرسوار ہوکراس کووقتی طور پراس قدر جکڑ لے کہ اس کو سچ جھوٹ، اچھے برے صحیح غلط اور بڑے چھوٹے کی تمیز روا رکھنے سے بھی محروم کردے وہ حقیقت میں عقل وشعور کی موت ہی ہے . اس لئے انسان کو اپنے اوپراپنے جذبات پر کامل کنٹرول ہونا چاہیے تاکہ کسی ایک کمزورلمحہ کی غلطی بعد میں ہمیشہ شرمندہ نا کرے۔

انسان کواللّہ کریم نےمخلوقات میں اگرشرف بخشا ہےتواسکی ایک بڑی اور اہم وجہ انسان کے پاس موجودسوچنے سمجھنے کی صلاحیت اورفیصلہ سازی کا اختیار ہے۔ اس کے بعدبھی اگرہم بطورانسان اپنے اوپر قابونہیں رکھ سکتے اور وقتی جذبات میں بہہ جاتے ہیں تو ہم میں اورحیوانوں میں کوئی فرق نہیں . انسان کو ہمیشہ ہرحال میں اپنے مزاج کوسمبھالنا آنا چاہیے تاکہ اسکی وجہ سے نا کسی دوسرے کا نقصان ہونا خود اس کا۔

☆☆☆

خود اعتمادی کامیابی کی ضمانت

لفظ خود اعتمادی ایک ایسا جذبہ ہے جسے انسان کو خود میں پیدا کرنا ہوتا ہے. انسان کو اس کی بہت ضرورت ہے۔انسان کو خود اعتماد ہونا چاہیے وہ جو بھی کام شروع کرے اُسے خود پر اعتماد اور بھروسہ ہونا چاہیے کہ جس کام کا انتخاب کرنے جا رہا ہے اُسکو وہ بھرپور طریقے سے پورا کر سکتا ہے۔خود اعتماد آدمی کبھی بھی کسی پر انحصار نہیں کرتا اپنے فیصلے کسی پر نہیں چھوڑتا سوائے اللہ پاک کی ذات کے۔ہاں مشورہ کرنا ایک الگ نقطہ ہے۔وہ اپنے عزیزوں سے مشورے لے سکتا ہے۔مگر کسی کو اپنی زندگی کے فیصلے نہیں کرنے دے سکتا۔

خود اعتمادی انسان میں اتنا بدلاؤ لے آتی ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کے حل کو با آسانی ڈھونڈ لیتا ہے اور اللہ پاک کی ذات پر پورا بھروسہ رکھتا ہے۔چاہے کام بڑا ہو یا چھوٹا خود اعتمادی انسان میں وہ بے چینی پیدا کر دیتی ہے جس سے انسان کو محسوس ہونے لگ جاتا ہے کہ وہ واقعی میں اس کام کی حد تک جا سکتا ہے۔اور کامیابی اُسکے قدم چومنے کی منتظر ہوتی ہے۔

انسان کو خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کو ڈھونڈنا ہوگا کہ آیا اُس میں کوئی خوبی یا صلاحیت ہے کیا وہ اس قابل ہے کہ اپنی خوبیوں اپنی صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر خود میں خود اعتمادی پیدا کر سکے اور اپنے فیصلے خود بہتر طریقے سے کر سکے اور بڑے چھوٹے کام میں مہارت حاصل کر سکے۔اس کے لیے انسان میں خوبی اور صلاحیت ہونا ضروری ہے اور ایک ایسا جذبہ بھی درکار ہے جو اس میں ایک تڑپ پیدا کر سکے۔

ہر انسان کو اللہ پاک نے ایک قیمتی ہیرا انعام کے طور پر نوازا ہے ویسے تو اللہ پاک نے انسان کو جو کچھ بھی دیا ہے وہ ہیرے جواہرات سے کم نہیں ہم جتنا شکر ادا کریں وہ بھی کم ہے

مگر یہاں جس ہیرے کی بات ہونے جا رہی ہے وہ دماغ ہے ۔ اللہ پاک نے انسان کو سوچنے سمجھنے کے لیے دماغ عطا کیا ہے۔ جس کی بنا پر وہ خود کو اس قابل سمجھ سکتا ہے کہ ہاں مجھ میں کوئی ہے کوئی خوبی ہے۔ اب صلاحیت یا خوبی بڑی ہو یا چھوٹی انسان میں خوداعتمادی پیدا کرنے کے لئے پانچ فیصد بھی کافی ہے جسے وہ خود بڑھاتا چلا جائے گا۔ جب انسان میں خوداعتمادی پیدا ہو گی تو چھوٹی خوبی کو کیسے بڑی خوبی میں بدل دے گا کیسے اپنی صلاحیتوں کو نکھارے گا یہ انسان کے خود کے اختیار میں ہے۔

یہاں چھوٹی خوبی سے مراد وہ خوبی ہے جو اُس انسان میں چھپی ہوئی ہے. اسے چھپی ہوئی خوبی بھی کہا جا سکتا ہے اور بڑی خوبی وہ مہارت ہے جو انسان محنت و ریاضت اپنے اندر سے باہر نکالے اور اُسے اپنی طاقت بنالے تو اُسے بڑی خوبی کہا جائے گا۔ یہاں بڑی خوبی سے مراد ظاہری خوبی ہے۔ جو خود میں سے جڑ سے نکال کر سامنے رکھ دی جائے اور اللہ کا شکر ادا کر کے آگے بڑھتا چلا جائے اور اس پر مہارت حاصل کرتا جائے۔ اللہ پاک نے انسان کو بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے اور اتنا نوازا کہ ہمیں خود کو بھی نہیں معلوم کہ ہم کیا کیا کر سکتے ہیں۔ اب ہمارا فرض ہے یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ اسے ہم نکھار کر اس قابل ہو جائیں کہ اُس پر مہارت حاصل کریں۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی اس سارے عمل کے لیئے ضروری ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہو کہ اس میں کیا کیا خوبی ہے کس کس قسم کی صلاحیت موجود ہے کیا وہ اتنا باصلاحیت ہے کہ خود میں تلاش کر سکے اگر تلاش کر چُکا ہے تو کیا وہ اس کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو سکے گا یہ سب عمل خوداعتمادی سے ہوگا اور خوداعتمادی کے لیئے ہوگا۔ جب تک وہ ان عوامل جو اس سب کے لیئے درکار ہیں اس پر عمل نہیں کرے گا خوداعتمادی اُس میں جنم نہیں لے سکے گی۔

اپنی خوبی اپنی صلاحیتوں کو ڈھونڈا جائے اور اُسے سِرے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ سب سے ضروری بات ہے اپنے ذہن کو قابو میں لانا اور یہ تصور کر لیا جائے کہ یہ یہ

خوبیاں مجھ میں موجود ہیں اور جو باصلاحیت ہیں ان میں، میں کمال کر سکتا ہوں۔ جب آپکا دل اور آپکا ذہن مطمئن ہو جائے گا تو آپکی خوبیاں آپکی صلاحیتیں آپکے لئے باعثِ فخر بن جائیں گی۔ خود اعتمادی کے لئے تمام عوامل غور و فکر کے ساتھ عمل کرنا ہوگا تب ہی وہ انسان کے خون میں اپنی جگہ بنا پائے گی۔

کئی طالبِ علم ایسے ہوتے ہیں جنہیں خود پر اعتماد نہیں ہوتا اُن میں ٹیلینٹ موجود ہوتا ہے مگر ظاہر کروانے سے ڈرتے ہیں۔ کیوں ڈرتے ہیں کیونکہ انہیں خود میں موجود لاوا کی طرح اُبلتی ہوئی خوبیوں اور صلاحیتوں کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ خود اعتمادی موجود نہیں ہوتی۔ اُنہیں چاہیے خود میں خود اعتمای پیدا کریں۔ اُنہیں خود پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ خود میں اعتماد نہیں ہوگا تو کامیاب ہونا مشکل تر ہوتا چلا جائے گا۔

ایک المیہ جو ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے کہ کچھ لوگ باصلاحیت ہوتے ہیں انہیں ایک لفظ شاباش کی ضرورت ہوتی ہے. فنکار کے لئے یہ لفظ بہت معنی رکھتا ہے۔ جب تک اُسکی حوصلہ افزائی نہ کی جائے اس میں آگے بڑھنے کا حوصلہ دم توڑتا چلا جاتا ہے۔ جو لوگ آگے نہیں بڑھ پاتے اُسکا ذمے دار معاشرے کو ٹھہراتے ہیں جو غلط ہے۔ اگر انسان کو خود کو کامل یقین ہو تو اسے آگے بڑھنے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی. جسے خود پر بھروسہ ہوتا ہے اور اللہ کہ ذات پر بھروسہ ہوتا ہے تو وہ ان چیزوں کی پرواہ نہیں کرتا . بلکہ عمل میں میدان کا راہی بن کر اپنی منزل کی جانب بڑھتا چلا جاتا ہے۔

قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ باصلاحیت اور نڈر انسان تھے اُن کی ہمت حوصلہ اور خود پر غیر متزلزل یقین و اعتماد ہی تھا جس کی بدولت وہ وطن کی آزادی کی جنگ بنا ہتھیار کے صرف دلیل کے سہارے لڑے بھی اور جیتے بھی . اگر وہ اپنی ذات پر بھروسہ نا کر کھو دیتے تو آج بھی مسلمان غلامی کی زندگی جی رہے ہوتے. ڈاکٹر عبدالقدیر خاں باصلاحیت تھے . اگر ان میں خود اعتمادی نہ ہوتی ان میں کچھ کر دکھانے کا جذبہ نہ ہوتا تو آج پاکستان کے پاس ایٹمی طاقت موجود نا

ہوتی۔شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ کو ہی دیکھ لیجیئے کتنے باصلاحیت تھے اگر خوداعتمادی نہ ہوتی لگن نہ ہوتی جذبہ نہ ہوتا تو آج اُن کا نام نہ ہوتا۔

ایک اور بات معاشرے میں یہ بھی دیکھی جاتی ہے کہ دوسرا کیا کہے گا دوسرا کیا سوچے گا اگر یہ بات ذہن میں ہے تو سب سے پہلے اس کو ذہن سے نکال کر آگے بڑھ جانا چاہیے. اب جن کو خود پر بھروسہ ہے اور مہارت حاصل کر چکے ہیں تو اُن کے لیئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عاجزی وانکساری کا مجسمہ ہوں کیونکہ اللہ پاک کو عاجزی ہی پسند ہے ایک لفظ استعمال کیا جاتا ہے جسے اوور کانفی ڈینس کہتے ہیں۔کچھ لوگ اس بیماری کا بھی شکار ہو چکے ہوتے ہیں۔ایک حد میں رہتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کو نکھاریں اپنی خوبیوں کو بڑھائیں اور اس کی حد تک جائیں مگر جب ایک مقام پالیں تو غرور وتکبر جیسی بیماری سے دور رہیں۔

یہ بیماری انسان کو غرق کر دیتی ہے۔عاجزی اختیار کر لیں۔تکبر انسان کے خون میں دوڑتا ہو تو انسان کے خود کے بس میں ہے کہ وہ اُسے نکال پھینکے پھر اللہ پاک کی ذات اور خوش ہوگی اور آپکے ہر جائز کام میں آپکی مدد ایسے کرتی چلے جائے گی کہ آپکو دلی سکون ملتا چلا جائے گا۔

انسان کے ذمہ محنت ہے اور محنت بھی ایمان داری اور اخلاص کے ساتھ، اسکے علاوہ اپنے ہونے کا یقین، ساتھ اس بات پر کامل اعتماد کہ ہم کچھ بھی چاہیں تو حکمت عقل شعور اور ریاضت ودانائی سے حاصل کر سکتے ہیں. دنیا کے تمام نامی گرامی افراد اگر اوپر گئے ہیں تو ان کی وجہ ان کی محنت ولگن کے ساتھ ساتھ ان نے اپنی ذات پر یقین اور کام پر ایمان تھا . وہ جانتے تھے کہ وہ جو کر رہے ہیں وہ انکو زندہ رکھے گا . وقت تاریخ کے صفحات انہی کو یاد رکھتے ہیں جو اپنے اندر کے ہنر کو زمانے کے سامنے لا رکھتے ہیں. ورنہ آپ تاریخ کا ایسا کوڑا بن جاتے ہیں جس کو کوئی یاد نہیں رکھنا چاہتا . اس لیے اپنے اندر جھانک کر اپنی اس خوبی کو پہچانیے جو دنیا میں آپکی پہچان بن سکتی ہے اور پھر بس کام میں جھٹ جائیں تاکہ وہ کامیابی جو آپ کو راہ دیکھ رہی ہے آپکو پا کر امر ہو جائے۔

جھوٹ ایک معاشرتی لعنت

جھوٹ ایک ایسا لفظ ہے جسے ہم لوگوں نے اپنی سیڑھی بنا لیا ہے۔کسی نے کوئی بھی کام کرنا ہوتو جھوٹ کا سہارا لیتا ہے اور حلال روزی کو خود ہی حرام روزی میں بدل دیتا ہے۔وہ رشوت لینا شروع کر دیتا ہے۔جھوٹ بولنا آج کے زمانے میں بہت عام ہو چکا ہے۔ ہر کوئی جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔کیا قائدِ اعظمؒ نے جھوٹ کی بنا پر پاکستان آزاد کروایا تھا۔کیا جھوٹ کی بنا پر اسلام پھیلایا گیا تھا۔ بے شک خدا سچائی کے ساتھ ہے اور جھوٹ بولنے والے پر خدا کی لعنت ہوتی ہے۔

جھوٹ سے فساد پیدا ہوتا ہے اور بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔جو صبر کا دامن چھوڑ دیتا ہے وہ پھر جھوٹ کو اپناتا ہے یہی وجہ ہے کہ امیر امیر تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔جھوٹ کا سہارا لے کر اور پیسہ لگا کر ڈگریاں حاصل کر لیتا ہے اور غریب کا بچہ تعلیم حاصل کر کے بھی بے روزگار رہتا ہے کیونکہ کسی بھی ادارے میں چلے جائیں وہاں ڈگری دیکھنے سے پہلے اِس کی سماجی حثیت کو دیکھا جاتا ہے۔لوگ جھوٹ کے سہارے ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔جھوٹ ایک فساد کی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ایک جھوٹ کے پیچھے انسان کو نا جانے کتنے جھوٹ اور بولنا پڑتے ہیں۔

ہمارے پیارے رسولﷺ اللہ کے آخری نبی جھوٹ کو سخت نا پسند فرماتے تھے اور اُن کے اُمتی ہونے کے ناطے ہمارا فرض ہے کہ ہم جھوٹ جیسی لعنت کو اپنے دلوں اور معاشرے سے نکال باہر پھینکیں پھر ہی ہماری پہچان مومنوں میں ہوگی۔کافر کی تو پہچان ہی یہی ہے کہ وہ بات بات پر جھوٹ بولتا ہے۔انسان کسی سے جھوٹ بولنے سے پہلے اپنے آپ سے جھوٹ بولتا

ہے۔سب سے پہلے اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے اور وہ اپنے آپ سے ہی غافل ہوتا چلا جاتا ہے۔ حضرت اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا تھا کہ

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تُو بھی ہے آستانہ
اے لَا اِلٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتارِ دلبرانہ کردارِ قاہرانہ

تاریخ بھی یہ بتاتی ہے کہ جب ایک شخص اپنی بُرائی والی زندگی سے پریشان ہو گیا تو وہ حضورﷺ کے پاس اپنی پریشانی لے کر گیا تو آپﷺ نے صرف اتنا ہی فرمایا تھا کہ جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔تو اس بات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جتنی بھی پریشانیاں ہوں جتنے بھی دکھ ہوں انہیں صرف دو چیزیں ہی ختم کر سکتی ہیں۔جھوٹ بولنا چھوڑ دیا جائے۔اِسی سے انسان برائیوں سے بچا رہتا ہے۔جھوٹ بولنا ایسی بُری عادت ہے جس کو ہمیشہ سے گناہ سمجھا گیا ہے۔

ہر معاشرے میں اسے ایک بہت بڑا اخلاقی جرم بھی کہا گیا مگر پھر بھی لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔بعض اوقات پڑھے لکھے لوگ بھی اس جرم کے مرتکب ہو جاتے ہیں اور ایسی بات کہہ دیتے ہیں جو حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی۔لوگ اپنی کسی کمزوری کو چھپانے کے لیے یا سزا سے بچنے کے لیے جھوٹ بول دیتے ہیں۔جھوٹ انسان کی شخصیت پر ایک بدنما داغ ہے۔حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ حضورﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سچ بولنا نیکی ہے اور نیکی جنت میں لے کر جاتی ہے اور جھوٹ بولنا فسق و فجور ہے اور فسق و فجور دوزخ میں لے کر جاتا ہے۔یہ بات سچ ہے کہ جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر ہے کہ سچ بول کر ہار جاؤ۔حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔

یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ یکم اپریل کو ہم لوگ جان بوجھ کر جھوٹ بولتے

ہے۔اپریل فول مناتے ہیں اور اُس پر خوشی بھی مناتے ہیں۔آج کے دور میں ہر کام جھوٹ کے سہارے کیا جا رہا ہے۔جھوٹ ہماری خوراک کی طرح بن چکا ہے کہ جھوٹ نہ بولا جائے تو دن نہیں گزرتا۔جب بچوں کہ سامنے کوئی جھوٹ بولتا ہے تو بچوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔جس کی وجہ سے وہ بھی اس لعنت کا شکار ہو جاتے ہیں۔اور ایک وقت آتا ہے وہ بھی جھوٹ کو ہر کام کرنے کی سیڑھی بنا لیتے ہیں اور ان کے گناہوں کے پلڑے بھاری ہوتے جاتے ہیں۔اس جھوٹ کی لعنت کو ہمیں مٹانا ہوگا پھر ہی ہم اس فخر کہ قابل ہو سکے گے کہ ہم حضورﷺ کے امتی ہیں۔

جھوٹ فریب دھوکہ دہی سے حاصل کی گئی وقتی کامیابی انسان پر ایسا قرض چھوڑ جاتی ہے جس کی ادائیگی اس کی نسلوں کو کرنا پڑتی ہے ۔دنیا کا کوئی معاشرہ اس وقت تک حقیقی معنوں میں مہذب اور ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتا جب تک وہ جھوٹ جیسے موذی مرض کا علاج نا کرے۔ بطور مسلمان ہم دنیا و آخرت کی دونوں زندگیوں پر یقین کرتے ہیں ۔ بلکہ ہماری آنے والی زندگی کا دارومدار ہماری موجودہ زندگی سے جڑا ہے ۔ جھوٹ کی وبا ایک مسلمان کی دنیا و آخرت دونوں کو تہس نہس کر دیتی ہے ۔اس لئے بطور مسلمان ہمارا یہ فرض ہونا چاہیے کہ نیکی اچھائی اور سچ کی ترویج کا باعث بنیں ۔ تا کہ ہماری دنیا و آخرت دونوں سنور سکیں۔

☆☆☆

قسمتِ نوعِ بشر تبدیل ہوتی ہے یہاں

یہ اس وقت کی بات ہے جب ایک بچہ اپنے والد صاحب اور اپنے بھائیوں کے ساتھ نظریہ پاکستان ٹرسٹ میں گیا۔اسے معلوم نہ تھا کہ یہ ادارہ کیا ہے آخر ایسا کیا ہے جو ہمیں یہاں آنا پڑا بہرحال تجسس کو یہ سوچ کر ختم کر دیا کہ والد صاحب لائیں ہیں کچھ اچھا ہی ہو گا۔ پہلا دن گزرنے کی دیر تھی پھر سیشن 2011 کا ایک مہینہ کیسے گزرا پتہ نا چلا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی میں وقت کو روک نہ سکتا تھا۔قدرت کے آگے کس کی چلتی ہے.

11 سال کا وہ بچہ 2012 کا شدت سے انتظار کرنے لگا،اُسے نظریہ پاکستان دوبارہ جانا تھا۔آپ کے ذہنوں میں سوال یہاں یہ اُٹھے گا کہ ایسا کیا ہے کہ وہ بچہ نظریہ پاکستان سمر سکول میں جانے کے لیئے بے تاب ہو چکا تھا .

میں بتا تا چلوں کہ نظریہ پاکستان ٹرسٹ صرف ایک ادارہ نہیں ہے بلکہ وہ بچوں کا دوسرا گھر ہے جہاں ماں باپ اپنے بچے ایسی سوچ والے قابل افراد کے پاس چھوڑ کر جاتے ہیں جو بچوں کو قوم کا قیمتی اثاثہ اور متاع سمجھ کر انکی ذہنی و روحانی تربیت کا سامان کرتے ہیں۔

ہر طالب علم کو اپنا بچہ سمجھ کر اس کا بازو تھام لیتے ہیں۔ بہرحال وہ بچہ 2012 میں بھی شاداں وفرحاں نظریاتی سمر سکول کے بارہویں تعلیمی سیشن میں شرکت کے لئے پہنچ گیا اور پہلے کی طرح اس سال بھی سیشن کے اختتام پر آنکھوں میں آنسو لیئے گھر لوٹا اس بار وہ پچھلے دو سالوں کی محنت کو رائیگاں نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

اس نے جو جو اس ادارے سے سیکھا اسے دہراتا گیا اور آگے بڑھتا گیا۔ پھر جب سمر سکول جاتا ہر مرتبہ نیا گُر سیکھ کر آتا۔اس نے اپنے والد صاحب سے متاثر ہو کر کالم نویسی شروع کر دی۔اسے نعت پڑھنے کا بھی شوق تھا یہ شوق بھی سمر سکول کی وجہ سے اس میں پروان چڑھ چکا تھا۔گھر سے تربیت کا اثر اسے کامیاب ہونے میں مدد دیتا رہا،نظریاتی سمر سکول میں چونکہ 6 سے 13 سال کے بچے ہی شرکت کر سکتے ہیں اس لئے ڈیسک پر بیٹھ کر نظریاتی تعلیم حاصل کا یہ سفر ایک حد تک ختم ہو گیا . لیکن درحقیقت یہ ایک پڑاو تھا ابھی تو منزل کی جانب آغاز سفر ہوا تھا.اس طرح اس سمر اسکول سے علمی ثمر پا کر وہ بچہ ایوانِ کارکنانِ تحریک پاکستان میں گاہے بگاہے کسی نہ کسی فکری نشست یا پاکستان آگاہی پروگرام میں شرکت کر کے اپنی علم پیاس بجھاتا رہا۔

نظریہ پاکستان ٹرسٹ کا معاون سٹاف اب بھی اس بچے کی ویسی ہی سرپرستی کرتا ہے۔6 جولائی 2019 کو جب اس بچے کو یہ معلوم ہوا کہ اسکے والد گرامی (جو کہ مشہور وکیل،کالم نگار اور تجزیہ نگار ہیں) کو نظریہ پاکستان ٹرسٹ میں بطور مہمانِ خصوصی مدعو کیا گیا ہے تو وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔اور والد صاحب سے کہہ ڈالا کہ میں بھی وقت کی پابندی کرتے ہوئے اپنی مادرِ علمی ضرور پہنچوں گا۔جب اگلی صبح وہ وہاں پہنچا وہی علمی نظریاتی تعلیمی تربیت کا ماحول اس کا منتظر تھا۔جس کو وہ چھوڑ کر گیا تھا۔

مہمانانِ گرامی سٹیج پر تشریف فرما تھے تو وہ بچہ جو 9 سال پہلے اس ادارے کے مسحور کن نظریاتی ماحول سے واقف ہوا تھا اور اس کی نظریاتی تربیت اس ادارے سے ہوئی جہاں کے سربراہ پیارے بابا مجید نظامیؒ تھے۔یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر رفیق احمد صاحبؒ،شیخ رشید صاحب،سر عابد شاہ صاحب،سر سیف صاحب اور باقی عملے نے اس ادارے کو ویسا ہی سنبھال رکھا ہے جیسا اسے ہونے چاہیے۔وہ بچہ جو اب مختلف شعبوں سے منسلک ہے وہ کوئی اور نہیں بلکہ صاحبِ تحریر حذیفہ اشرف عاصمی ہے۔میں یہ بات بتاتا چلوں کہ سیشن ختم ہونے سے خاص فرق نہیں پڑا کیونکہ وہ سب استاد جو وہاں اپنے فرائض بخوبی نبھا رہے تھے وہ اب بھی میری رہنمائی

کرنے کے لیئے موجود ہیں۔

حذیفہ کے لئے استاد تو روشن ستارہ ہے
اگر بھٹکے تو جگنو بن کے رستہ ہم کو دکھلاتا

ملک کے طول وعرض میں ہزاروں سرکاری و پرائیویٹ ادارے قائم ہیں جو سال بہ سال سے نوجوان نسل کو ڈگریاں تھما رہے ہیں۔مگر کتنے ایسے ادارے ہیں جو آج بچوں کی ذہنی روحانی علمی تربیت کا سامان کر رہے ہیں۔کتنے ادارے ایسے ہیں جن کا مقصد نا ڈگری ہے نا پیسہ .وہ وطن جو نظریہ پر قائم ہوا جس کو چلنا بھی ایک ایسے نظریے پر تھا جس کو پانے کی پاداش میں لاکھوں افراد نے ہنستے ہوئے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی تھی .افسوس ایسے اداروں کی تعداد نا ہونے کے برابر ہے .وہ وقت جو اداروں کا واحد مقصد مادی اسباب تک پہنچنے کی تعلیم دینا ہو اس وقت میں یہ ادارہ آج کی نسل کو اس کے روشن ماضی کی یاد دلاتا ہے .اسکو آگے بڑھنے کے ساتھ اپنک جڑ کی پہچان کا درس دیتا ہے .بچوں کو کامیابی کے حقیقی معانی ومفہوم سے آگاہ کرتا ہے .بچوں کی علمی پیاس تو بجھاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ ان کو اس مٹی سے محبت کا سبق بھی پڑھاتا ہے .اس وجہ سے یہ ادارہ میری اور مجھ جیسے لاتعداد بچوں کے لئے ایک ایسے خواب کو حیثیت رکھتا ہے جس کو دیکھنے کے بعد ہم جاگنا نہیں چاہتے.اسی ادارے اور اس سے جڑے محنتی مخلص اور باوقار انسانوں نے بچوں کو استاد سے بڑھ کر اپنایا ہے تاکہ ہم جب اس ماحول سے نکالیں تو ہمارے پاس ڈگری کے ساتھ عقل وخرد بھی ہو اور ہمارے اندر ایک نظریہ بھی ہو اور ہم مادی اسباب کی جگہ روشن اصولوں کا پیچھا کریں .ہمارا مقصد چند عارضی مفادات سے بہت بلند ہو .میں یقین اور دعوے سے کہتا ہوں یہ عظیم مادر علمی اپنے مقصد میں کامیاب ہے.

اللہ پاک اس ادارے اور اس سے جڑے تمام افراد کو سلامت رکھیں اور ہم سب

کے والدین کو بھی جن کے بغیر ہم کچھ بھی نہیں۔ آخر میں یہ کہوں گا کہ جس جس نے مجھ سے پوچھا کہ آخر اتنی خوداعتمادی کہاں سے آئی میں ایک ہی جواب دیتا ہوں کہ سب سے پہلے تو میرے والد صاحب سے اور دوسرا نظریہ پاکستان سے جس نے ہمارے ابلتے ہوئے جوش کے لاوے کو اور ابلنے پر مجبور کر دیا اور آج ہم کسی مقام پر ہیں۔

شکریہ نظریہ پاکستان
شکریہ نظریاتی سمر سکول
پاکستان زندہ باد

☆☆☆

لفظوں کے جادوگر سے ایک ملاقات

''سوچ کے سفر'' کا ایک ایسا دن ایک ایسا بیان جو قاسم علی شاہ صاحب سے جڑا ہوا ہے۔

سیوا و خدمت سے لے کر گیٹ تک چھوڑ نا کسی بڑے اور دلدار آدمی کی نشاندہی کرتا ہے ایسا ہی کچھ قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن میں دیکھنے کو ملا وہاں نا صرف قاسم علی شاہ صاحب ہی آگے بڑھ کر تمام معاملات کو دیکھ رہے تھے اور سب کی خیریت دریافت کر رہے تھے بلکہ وہاں موجود انکا عملہ بھی بھرپور طریقے سے خیر مقدم کر رہا تھا۔آخر شاہ صاحب کے زیرِ سایہ ہیں انہی کی طرح ہونگے۔شاہ صاحب کے لیکچرز کون نہیں سنتا اور کون استفادہ نہیں کرتا؟ بے شُمار لوگ ہیں جو شاہ صاحب کی ویڈیوز دیکھ کر ان کی باتوں پر عمل پیرا ہو کر خود کو بدلتے ہیں اپنے ارد گرد منفی سوچوں کو مثبت میں بدلتے ہیں اور وہ لوگ صرف لاہور یا کراچی میں ہی موجود نہیں بلکہ پاکستان بھر اور پاکستان سے باہر پھیلے ہوئے ہیں شاہ صاحب کی لیکچر شپ کیا خوب ہے کہ گھر بیٹھے آپکو ایسے ویڈیو کلپس مل رہے ہیں جن کو سن کر آپ پریشانی کی تہہ سے نکل کر ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔

میری زندگی میں بھی ان ویڈیوز کو سننے اور ان سے ملنے کے بعد بہت مثبت بدلاو آیا جو بیان سے باہر ہے۔مگر میں یہ ضرور بتانا چاہوں گا میں نے ان سے کیا سیکھا۔

میں جب سے شاہ صاحب کی ویڈیوز سن رہا ہوں اسی وقت سے ان سے ملنے کی خواہش دل میں پیدا کیے ہوئے تھا اور وہ الحمداللہ سے پوری بھی ہو چکی ہے میں ان سے اس سے قبل دو بار ملاقات کر چکا تھا مگر تیسری اور تفصیلی ملاقات "پاکستان چینجرز فارم" کی وجہ سے ممکن

ہوئی۔ جب معلوم ہوا اس تنظیم نے شاہ صاحب کے ساتھ میٹینگ رکھی ہے تو جھٹ سے اپنا نام لکھوا دیا نوید بھائی جو کہ پاکستان چینجرز فارم کے بانی ہیں ان کو پہلے سے جانتا تھا مگر جب مجھے فلک زاہد نے بتایا کہ نوید بھائی نے کچھ ہی رائٹرز کو چننا ہے تو نام لکھوانے میں دیر نہ کی اور انکا حصہ بن گیا شاہ صاحب کی فاؤنڈیشن کی بات کی جائے تو ایسی فاؤنڈیشنز میں نے بہت کم دیکھی ہیں اچھے خیر مقدم کے بعد ہمارے درمیان بیٹھ جانے کے بعد لکھاریوں کے ساتھ گفتگو شروع ہوئی۔ میں خاموشی سے لفظوں کے جادوگر کو سنتا رہا اور حیران ہوتا رہا کہ بہت کم ہی ایسے افراد ہوتے جو مسلسل بول سکتے اور بولنا بھی ایسا کہ بات سیدھی دل میں اتر جائے ایسا اثر میں نے شاہ صاحب کی زبان میں دیکھا . بلاشبہ وہی انسان مسلسل بول سکتا جس کے پاس وسیع علم ہو اور اس بات سے سب بخوبی واقف ہیں کہ شاہ صاحب نے اپنے زمانہ طالبِ علمی سے ہی مختلف کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔

آغاز میں شہزاد روشن صاحب نے بتایا کہ اس فارم میں بہت سے لکھاری اور CEO,s وغیرہ بھی موجود ہونگے اور کچھ وقفے کے بعد نشست رکھتے رہا کریں گے اور موضوع گفتگو یہ ہے کہ "ہم کیسے بدل سکتے ہیں" اور اکثر سننے کو ملتا ہے کہ سینئرز سپورٹ نہیں کرتے تو اس بات پر زور ڈال کر بتایا کہ آپ بھی کسی نہ کسی کے سینئر ہیں ہم بنیادی طور پر سپورٹ کرنا شروع کریں گے ان کا حوصلہ بڑھانا شروع کریں گے تو سپورٹ نہ کرنے والی بات پر قابو پایا جا سکتا ہے میٹنگ میں شرکت کرنے والے زیادہ تر افراد لکھاریوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے. کچھ شعراء کرام تھے کچھ کالم نویس تھے اور کچھ افسانہ نگار موضوع کی بات کی جائے تو "اس معاشرے میں ایک لکھاری کا کیا کردار ہے" اسی پر شاہ صاحب نے جواب دیا کہ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا لکھنا کہ جس لکھے کی زندگی صرف ایک دن تک ہے تو میں اسے نہیں مانتا جو لوگ دل سے لکھ گئے انکا لکھا ابھی تک چل رہا ہے اور پھر شاہ صاحب سے باتوں کا سلسلہ جاری رہا اس میں شاہ صاحب سے انکے بارے میں بھی پوچھا گیا اور کچھ نے لکھنے کے حوالے سے بھی پوچھا۔

شاہ صاحب نے شعرا کرام کے بارے میں بھی ایک اہم بات بتائی کہ آج کل کچھ شعرا کرام چھلانگیں لگا کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں شاعری میں وہ اثر بہت کم نظر آتا ہے درد جھوٹا ہو چکا ہوا ہے محبت کو جھوٹا کر دیا گیا ہے۔ انکا یہ بھی کہنا بجا تھا کہ وسیع مطالعہ انسان کو اچھا لکھاری بنا دیتا ہے۔ سوالات کا سلسلہ جاری رہا اور پھر ان پر ہونے والی تنقید کے بارے میں پوچھا گیا تو انکا جواب بھی مثبت رہا یوں بھی ہم اس انسان سے کیسے اس چیز کی اُمید کر سکتے کہ جو positivity بانٹ رہا ہے خود منفی سوچ رکھے؟ عاجزی بھی شاہ صاحب کے اندر بھری پڑی ہے شاہ صاحب جب بھی اپنی کسی کامیابی کا ذکر کرتے تو اللہ کا شکر ادا کرتے چلے جاتے بے شک اللہ نے ہی اس انسان کو اتنا نوازا جو لوگوں کی بہتری کے لئے دن رات محنت میں لگے ہوئے ہیں اور اسکا پھل بلاشبہ انکو ملتا رہے گا۔

شاہ صاحب نے ایک اور اہم بات کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی کہ آج کل کچھ لوگ ہوتے ہیں وہ کسی کو استاد نہیں مانتے کہتے ہیں ہم خود ہی یہاں تک آئے تو یہ بات غلط ہوتی ہے ہماری زندگی کا کوئی بھی کام ہے جو ہم کرتے ہیں اسکے لئے ہمارا استاد ہوتا ہے چاہے وہ کسی بھی کام کے بارے میں ہماری رہنمائی فرمائے۔ شاہ صاحب کا اس بات پر بھی توجہ کروانا تعریف کے قابل ہے کہ کچھ لوگ سینئرز کو اور مشہور و معروف لوگوں کو صرف تصاویر اور سیلفیز کی حد تک رکھتے ہیں اور بتائے گئے کام پر عمل نہیں کرتے تو یہ واقعی میں ہی قابلِ غور بات ہے اس ملاقات کے بعد شاہ صاحب کے ساتھ باہر تشریف لے گئے اور گروپ فوٹو بنایا گیا اور ہمیں نہایت ہی خلوص و پیار سے اللہ حافظ کہا اور اپنی اگلی میٹنگ میں چلے گئے۔

اس سب کے بعد ہم دوبارہ اندر گئے اپنا فیڈ بیک سب نے دیا اور بتایا گیا کہ شاہ صاحب سے ملاقات کے بعد کیسا لگا آج کی نشست کیسی رہی اور مستقبل کے منصوبے کے بارے میں بات کی گئی۔

آخر میں بس اتنا کہوں گا شاہ صاحب کے ساتھ اس مختصر وقت میں میں نے بہت کچھ

سیکھا۔بعض افراد کے پاس گویائی ودیعت خداوندی ہوتی ہے۔ان کو یہ انعام یہ تحفہ اللّہ سے ملا ہوتا ہے۔ان کے الفاظ انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔انسان کے وجود کو لرزا دیتے ہیں۔ انسان کے اندر کی دھول چھٹ جاتی ہے۔ایسے ہی افراد کے قبیلہ کے حقیقی شہسوار شاہ صاحب ہیں۔ان کے پاس گزرے لمحات بہت یاد رہیں گے۔کیوں کہ ان میں ہم سب نے آگے بڑھنے کا نیا حوصلہ حاصل کیا۔ہم کو معلوم پڑا کہ اگر انسان مصمم ارادہ کر لے تو مسدود راستے بھی کھل جایا کرتے ہیں .شاہ جی دور حاضر کا بہترین دماغ ہیں جن کی بدولت ہم جیسے بے شمار نوجوان ذہن علم سے منور ہو رہے ہیں۔

میں شکر گزار ہوں پاکستان چینجرز فارم کا اور قاسم علی شاہ صاحب کا۔ جزاک اللہ۔

☆☆☆

ادب کا سورج طارق بلوچ صحرائی

طارق بلوچ صحرائی، افسانہ نگار ہیں اور اسی قلم قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ جیسے درخشاں ستارے نمایاں ہیں۔
صحرائی صاحب کی دو کتابیں سوال کی موت اور گونگے کا خواب شائع ہوچکی ہیں اور تیسری کتاب لمس کی چُپ زیرِ طبع ہے۔

پاکستان چینجرز فورم کے زیرِاہتمام افسانہ نگار طارق بلوچ صحرائی کے اعزاز میں ادبی نشست کا انعقاد ایوگ لائف کلاوئڈ ٹیکنالوجی میں ہوا۔ چینجرز فورم میں قلم قبیلے کے افراد ہیں جو مستقبل میں الفاظ کو جوڑ کر ادب کی تخلیق میں اپنے حصے کی شمع جلانا چاہتے ہیں۔ اور اس تحریر میں اپنے سوچ کے سفر کا ایک اور خوبصورت دن بیان کرنے جا رہا ہوں۔

بندہ رزق حرام نہیں کھاتا، رزق حرام بندے کو کھا جاتا ہے یہ عمدہ اور سبق آموز سطر پڑھتے ہی تجسس ہوا کہ سطور لکھنے والے صاحب کون ہیں؟ فطرتی بات ہے جب ہم اچھی چیز دیکھتے، اچھا سنتے یا پڑھتے ہیں تو اسکے خالق کو جاننے کی خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے خوبصورت جملوں کے خالق کو جاننے کے لئے گوگل مہاراج کو تکلیف دی اور جناب نے زیادہ بحث نہ کی اور کچھ ہی لمحوں میں اطلاع کر دی کے جناب جس کی تلاش میں ہیں یہ لیں آپکے سامنے حاضر ہے۔ وہاں یہ سطر لکھی دیکھی تو اسکے نیچے نہایت ہی خوبصورت نام چمک رہا تھا مذکورہ نام سے پہلے باقاعدہ آشنائی نہ تھی۔ ادب سے تعلق رکھنے والے اس نام کو سن کر زبان سے یہی بولتے سنائی دیتے ہیں کہ عمدہ لکھاری اور عمدہ شخصیت۔ آپ کا انتظار ختم کرتے ہیں آپکو بھی بتاتا چلوں گوگل مہاراج نے جو نام میری سکرین پر ظاہر کیا وہ طارق بلوچ صحرائی صاحب کا اسم گرامی تھا۔ نام

میں اور انکی اس سطر میں اتنی کشش تھی کہ جناب باقی تحریروں کو پڑھ کر ان پر دل آنے لگا اور نفیس انداز سے لکھا ہوا بے شک ہمیشہ کے لئے امر ہو چکا ہے کچھ ہی عرصے بعد پاکستان چینجرز فارم جو بہتر انداز میں تخلیق کار شخصیات سے مثبت پیغام پہنچانے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں اُن کا پیغام آیا کہ اگلی ملاقات عصرِ حاضر کے عظیم دانشور، مفکر اور منفرد افسانے لکھنے والے محترم طارق بلوچ صحرائی سے ہے۔تو پوری ٹیم سیکھنے کا پختہ ارادہ باندھ چکی تھی اور ہم سب خبیب احمد کنجا ہی کے آفس ایوگ لائف کلاڈ ٹیکلنا لوجی میں پہنچے۔نہایت خلوص و پیار کے ساتھ ہمارا شاندار استقبال کیا گیا نشست کے آغاز سے قبل ٹیم کے لوگ مختلف شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں تو باتوں میں مشغول ہونے میں وقت نہ لگا۔

صحرائی صاحب کے آتے ہی انکے احترام میں سب کا اس جذبے کے ساتھ کھڑا ہونا اس بات کی ترجمانی کر رہا تھا کہ ہماری ان سے محبت ان کو دیکھتے ہی شدت پکڑ چکی تھی۔نفیس انداز میں گفتگو کا انداز اپناتے ہوئے جناب نے آتے ہی اپنی عاجزی سے ہمارے دلوں میں گھر کر لیا اور ہمارے لئے ان سے گفتگو کرنا آسان ہو گیا۔کہنے لگے کہ "میں تو آپ سب سے سیکھنے آیا ہوں"۔ہماری خوشی دیدنی تھی کہ اتنا اعلی ظرف انسان حال اور مستقبل کے شاہینوں کے لئے میسر ہے۔گفتگو کا آغاز شہزاد بھائی اور نوید بھائی نے مل کر کیا اور تقریبات کی اسلامی روایات کو قائم رکھتے ہوئے قرآن کریم کی تلاوت کی گئی اور یہ عظیم سعادت حافظ وسیم کے حصے میں آئی۔اس کے بعد موصوف سے گفتگو کا آغاز ہوا ہر بات میں ایک اچھا سبق چھپا ہوتا تھا ہر بات پر دل سے ایک آواز نکلتی تھی کہ بھئی واہ کیا کہنے۔انکی کتاب "سوال کی موت" پر تھوڑی سی بات ہوئی اور اس میں سے کچھ سنانے لگے جو سن کر ساری ٹیم نے ہر عمدہ سطر پر تالیاں بجائیں اور پھر باری آئی انکی دوسری کتاب کی جو کہ " گونگے کا خواب" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

صحرائی صاحب کا تعلق محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ اور اشفاق احمد صاحب سے بہت گہرا رہا۔اور وہ تعلق ان کی شخصیت میں ابھی بھی زندہ و جاوید ہے انکا کہنا تھا کہ بانو قدسیہ انہیں کہا

کرتی تھی کہ تم میرے پاس ہفتے میں ایک بار لازمی آیا کرو۔اتنی بڑی سعادت کسی نصیب والے کو ہی ملتی ہے۔موصوف کا تعلق موٹیویشنل سپیکر قاسم علی شاہ سے بھی بہت گہرا ہے۔ ہمارے ساتھ بہت سی باتیں ہوئی اور دیکھنے میں آیا کہ ہمیں ان جیسا بننے کے لئے بہت محنت درکار ہے۔ بات بات پر نوجوان نسل میں موٹیویشن پیدا کرنے کے لئے تجاویز بھی دی گئی۔لکھاریوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ مختلف چکروں میں نہ پڑیں اچھا سوچیں اچھا جائزہ لیں اور اچھا لکھیں اور اللہ سے دعا کریں کہ میرے ہاتھ سے کسی کا نقصان نہ ہو میرے سے اچھا ہوجائے کسی کا اور ہوتا بھی ہے پوزیٹیو ہیں تو آپکا ایک لفظ بھی انرجی ہے اور انرجی نے ہمیشہ رہنا ہے۔نیگیٹیویٹی نے بھی رہنا ہے اور پوزیٹیویٹی نے بھی رہنا ہے یہ جو زلزلے آتے ہیں یہ نیگیٹیوٹی کی وجہ سے ہی تو ہیں کہ ہم نے فضا میں اتنی نیگیٹویٹی پھیلا دی ہے۔

سارا ڈیپریشن کی وجہ بن رہی ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ ادویات ڈیپریشن کی ہیں۔تو ہم نے اب ان کے مقابلے میں اپنے حصے کے چراغ جلانے ہیں۔ جناب کا کہنا تھا کہ ہم نے نفرتوں کے اتنے بیج بو دیے ہیں کہ توبہ ہے اسی لئے ہمیں اب تیسری نسل تیار کرنی ہے جو پازیٹیویٹی بات کرے گی جو پھولوں کی بات کرے گی جو تتلیوں کی بات کرے گی جو جگنوں کی بات کرے گی جو محبتوں کی بات کرے گی جو آسانیوں کی بات کرے گی جو اُجالوں کی بات کرے گی اور جو خدمت کی بات کرے گی۔

صرف پازیٹیویٹی کی بات کرنی ہے۔اللہ کہتا ہے کہ میں بندے کے گُمان کے مطابق ہوں تو ہمارا رب ہم سے بہت پیار کرنے والا ہے۔وہ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا ہے جس طرح ہم چاہتے ہیں ملک میں ترقی ہو لوگوں میں ایک جذبہ پروان چڑھے ایسا معاشرہ تشکیل ہو جائے کہ مہمان آیا ہے اور گھر میں تھوڑا سا کھانا ہے تو گھر کے چراغ بجھا کر بچوں کو سُلا کر مہمان کو کھانا دے دیں ہم چاہتے ہیں کہ وہ کھالیں۔ایسا معاشرہ بن جائے کہ ایک شہید ہونے والا کہتا ہے کہ پانی اگلے کے پاس لے جا اور جب اگلے کے پاس جاتا ہے وہ بھی یہی کہتا ہے اور تب

تک وہ شہید ہو چکا ہوتا ہے۔اللہ نے پرندوں کا تناسب محبت کے ساتھ رکھا ہے۔اور پرندے اب ختم ہو چکے ہیں ہمیں اپنا فرض ادا کرنا ہے جہاں پر بیٹھنا ہے اپنی جگہ صاف کر کے بیٹھنا ہے۔

بتانے لگے کہ قاسم علی فانڈیشن میں مجھ سے کسی نے سوال کیا کہ تقدیر کیا ہے۔میں نے بتایا تقدیر کچھ بھی نہیں ہے۔وہی واپس آنا ہے جو آپ دے چکے ہیں۔آپ نے محبتیں بانٹی ہیں دعائیں دی ہیں آسانیاں پیدا کی ہیں۔خدمت بانٹی ہے۔آپ نے نفرت بانٹی ہے گالیاں دی ہیں بدعائیں دی ہیں وہ سب کچھ پلٹ کر آجائے گا یہ کس وقت پلٹ کر آئے گا یہ ہمیں نہیں معلوم تو یہ ہے تقدیر۔آنا وہی ہے جو آپ نے دیا ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ نے کانٹے بکھیرے ہیں تو آپ کو پھول مل جائیں گے never کیونکہ یہ law of nature ہے۔اسی کے ساتھ چائے بسکٹس میز پر موجود ہمیں دیکھتے رہے۔تو ہم نے انکی بھی شان بڑھائی اور توقیر کھرل اورنوید بھائی نے فرمائش کی کہ حذیفہ میاں اب کوئی کلام سنا دیں۔مجھے منقبت پڑھنے کا حکم ہوا تو صحرائی صاحب سے اجازت لے کر پڑھنا شروع کر دی ایک الگ ہی کیفیت سے طاری ہوئی۔سب نے انہاک سے سنا۔اس کے بعد صحرائی صاحب نے بات کو آگے بڑھاتے ہوا کہا کہ کہانی کی بات ہے تو میری بیٹی نے ایک بار مجھ سے پوچھا کہ بابا کہانی کیسے لکھتے ہیں تو اس کے بارے میں بتانے لگے اور جو بتایا وہ انکی آنے والی کتاب "لمس کی چیپ" میں درج ہے۔کچھ یوں تھا کہ بیٹا تخلیق بڑی مشکل ہوتی ہے میں مسکرایا بیٹا تخلیق کار بننا اندر کے بھیڑیے کوسوسال کے لئے سلانا پڑتا ہے۔سانحہ کربلا کو یاد کرنا پڑتا ہے،صحرائے کربلا کی پیاس کو اپنے اندر اُتارنا پڑتا ہے۔اسکے لئے دوسروں کو روشنیوں کے حوالے کر کے خود کو اندھیرے میں لے جا کر جگنوں کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔تب کہیں جا کر اس پر کہانی اُترتی ہے۔یہ خود خانہ بدوش ہوتا ہے مگر ہر شخص کے لئے آشیانہ اٹھائے پھرتا ہے۔۔عمر بھر انکے لئے روتا رہتا ہے جو اپنی کاغذی گھروں میں چراغاں کر بیٹھے تھے۔جناب کی اس بات نے دل میں ایک بار پھر سے گھر کر لیا اور سب عش عش کر اٹھے۔

اس سے قبل تھرڈ جنریشن کے حوالے سے بات ہو رہی تھی تو میں نے اپنا ایک شعر سناتے ہوائے سوال کا آغاز کیا کہ

بدل دوں گا عمل جو بھی غلط ہے

میں کہتا ہوں مگر کرتا نہیں ہوں

سر میں اس لئے نہیں کر پا تا کیونکہ پاور کے آگے کسی کی نہیں چلتی اور سچ بولنے کے لئے ہمت چاہیے اور پوزیٹیو یٹی بھی وہیں آتی ہے جہاں سچائی ہو تو تب تھرڈ جنریشن کیا کرے گی اس وقت جناب نے جواب دیا کہ آپنا کردار بہتر بنالیں آپکا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔نشست اختتام پذیر ہو رہی تھی سب نے سر سے باتیں کی ان سے سوالات پوچھے ایک منفرد اور کمال کی نشست رہی۔

ہم نے ان کے ساتھ گزارے مختصر وقت میں مثبت جذبات وخیالات کا ایسا خزانہ پایا جواب بھی ہمارے اندر کہیں موجود ہے۔ان کا لفظ لفظ حقیقت اور سچ تھا۔ہم نے ان لمحات میں محسوس کیا کہ ہم بھی اس ماحول میں جو تاریکی واندھیرے کا مسکن بن رہا ہے ایک دیا تو جلا سکتے ہیں۔کیوں کہ امید کا دیا کہیں بھی روشن کیا جا سکتا ہے۔اور امید سے بڑی دولت کوئی نہیں ہوتی بس انسان کے بس امید مثبت ہونی چاہیے تا کہ اس سے خیر پھیلے شر نا۔صحرائی صاحب کا کہا خوشبو کی طرح فضا میں بکھرا ہوا تھا اور سب اس علمی ہوا میں اس تازگی کو اپنی اپنی وسعت کے مطابق روح تک جذب کر رہے تھے۔دن اور ملاقات ضرور ختم ہوگئی مگر سوچ کا سفر اس کے بعد مزید تیز ہو گیا۔

ہم ایسی نشست پھر سے رکھنا چاہتے ہیں جس کے لئے میں پی سی ایف سے گزارش کرتا ہوں۔

اس نشست میں شرکت کرنے والے نوید اسلم اور شہزاد روشن گیلانی، پی سی ایف کا آغاز کئے ہوئے ہیں بھی موجود تھے اور توقیر کھرل جو کہ مارگلہ میگزین کے سب ایڈیٹر ہیں خبیب

کنجاہی نے نشست کے انتظامات میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔نوجوان لکھاری ثاقب رضا بلوچ، دو کتابوں کی مصنفہ محترمہ فلک زاہد صاحبہ بھی موجود تھی۔ذیشان سردار اور عدیلہ آدی لکھاری بھی نشست کا حصہ تھیں ہمدوش سردار تھیٹر فنکار ہیں لیکن گوناں گوں مصروفیات سے وقت نکال کر نشست میں آئے ٹیچنگ پرفیشن سے وابستہ شہروز، نئے لب ولہجہ کے ترجمان نوجوان شاعرہ شانیہ چودھری،عرفان حیدر،شریف رانا، شاعر کفایت رضوی، شاعر رانا قاسم،فریال شیخ،مسرت ناز صاحبہ ڈبیٹر اور ماہر نفسیات حفصہ خالد اور بندہ ناچیز حذیفہ اشرف علمی و ادبی نشست میں موجود تھے صحرائی صاحب سے شرکاء نے سوال جواب کی نشست بھی کی۔نشست کے آخر میں سب نے صحرائی صاحب کے ساتھ تصاویر بنائیں یادگار نشست کبھی نہ فراموش کرنے والی ہے خاص طور پر یہاں سے ملنے والا فیض تو کسی صورت بھی نہیں۔اور اسی کے ساتھ سوچ کے سفر کا ایک اور دن اختتام کو پہنچا۔

☆☆☆

روشنی کا پیامبر سلمان عابد

"ناکامیوں سے سیکھ کر ایک مقام رکھنے والے ہمارے معاشرے کے لئے وہ مثالیں ہیں جن کو بُھلایا نہیں جا سکتا" یہاں سے شروع ہوئے اور "چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو منانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اپنی خوشیوں میں شریک کرنا نہایت عمدہ عمل ہے" پر ختم ہوئے۔ یہ میری سوچ کے سفر کا ایک اور دن تھا جس میں مجھے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ مجھے ادبی ماحول میں ڈھلنے سے لے کر دوستوں کو الوداع کہنے تک کا مرحلہ بھی سیکھنا تھا۔ مجھے محبتوں بھرے لہجوں کو صرف سننا ہی نہیں بلکہ محسوس بھی کرنا تھا اور ان دلکش لہجوں کے مالک افرادِ سخن کو اپنے دل کے کسی درجے میں گھر بھی دینا تھا۔ جی ہاں میری سوچ کے سفر کا آغاز تو بچپن سے ہو چکا تھا مگر ٹھہرے ہوئے اس سفر کو بہت عرصہ پہلے ایک راہ مل چکی تھی۔ اس راہ تک پہنچنے کے لئے پاکستان چینجرز فارم نے میرا ہاتھ پکڑا اور یہ ہاتھ شفقتوں اور محبتوں بھرا تھا۔

اور اسی فارم کے سائے میں ایک بار پھر سے کچھ سیکھنے سمجھنے اور کہنے کے لئے بہت عمدہ صحافی، کالم نگار، تجزیہ نگار، مصنفین اور اساتذہ ادب سے ہماری ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ان ملاقاتوں میں سے ایک شام محترم سلمان عابد صاحب کے ساتھ گزری.

سلمان عابد سے ملاقات کے لئے ہم ان کے آستانہ ادب پر وقت مقررہ پر پہنچے.
جب سلمان عابد صاحب تشریف لائے ہم سب متلاشیان ادب انکے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ جناب سلمان صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ہم انہیں کبھی کسی ٹی وی چینل پر دیکھ رہے ہوتے ہیں کبھی ان کے اخباری کالم پڑھ کر انکے خیالات سے مستفید ہو رہے ہوتے ہیں۔ محفل ادب وسخن کا آغاز کلام پاک سے کیا گیا جس کی مرضی کے بغیر کائنات کا کوئی کام نہیں

ہوسکتا۔ پھر سب کا مختصراً تعارف ہوا۔سلمان عابد صاحب نے گفتگو کا آغاز کیا جناب نے موجودہ دور کے مطابق زندگی گزارنے کے چند طریقے بتائے۔مطالعہ کتنا ضروری ہے اس پر اظہار خیال کیا۔ناکامیوں سے سیکھنے مشکلات سے لڑنے غیر ضروری آسائشات کو چھوڑنے اور ہر حال میں خوش رہنے پر نہایت سلیقے سے بات کی، جو سب سامعین کے دل میں اتر گئی۔

شہزاد بھائی نے درمیان میں سب کی توجہ اس بات کی جانب مبذول کروائی کہ جناب ایک دن میں بہت کچھ کر رہے ہوتے ہیں انکا کالم بھی آتا ہے ٹاک شوز بھی کرتے ہیں پڑھاتے بھی ہیں اور اپنے باقی فرائض کو سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ صبح یا شام کی سیر بھی کرتے ہیں۔یہ بات ہمارے لئے ویسے تو نئی نہ تھی مگر ایک دن میں اتنا کچھ کرنا اور پھر خود پر بھی توجہ دینا قابل تحسین عمل ہے۔

سلمان عابد صاحب نے کہا کہ جو لوگ کچھ کرنے کا سوچتے ہیں تو وہ اسکی منصوبہ بندی کرتے ہیں اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایک خاکہ بناتے ہیں۔جو کام انہوں نے کرنا ہوتا ہے اسکو جنون بنا لیتے ہیں کہ اسے کیسے عملی جامہ پہنایا جائے۔مذید کہنے لگے کچھ لوگ ہوتے جن کی تعلیم کا مقصد صرف ڈگری کا حصول ہوتا ہے۔

اور اسکے بعد وہ اپنا ٹارگٹ ملازمت رکھتے ہیں تاکہ زندگی کو بس اچھے سے گزار سکیں۔ہمیں ہماری سوچ اور شوق کے مطابق کچھ کرنا چاہیئے۔ہمیں آگے بڑھنا ہے تو کچھ بنیادی باتوں کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے جنون ہمیشہ ہمیں موٹیویٹ کرتا ہے۔اس کے بعد محنت اور صلاحیت کو بروئے کار لایا جائے کیونکہ یہ دوسری کنجی ہے۔کچھ مقاصد طے کرنے کو کہا گیا۔ہم جانا کہاں چاہتے ہیں یہ سب ہمیں معلوم ہونا چاہئے۔ناکامیوں سے گھبرا کر بھاگنا بزدلوں کا کام ہے اپنی کامیابی کی خوشی منانا بہت ضروری ہے۔ہم ہماری زندگیوں کے ساتھ جڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کی خوشیوں کو مناتے نہیں اور ایسا کرنا ہماری آگے بڑھنے کی رفتار کو کم کرتا ہے اور منفی کردار ادا کرتا ہے۔

جناب نے ان لوگوں کے متعلق آگاہ کیا جو نوکریاں لینے آتے ہیں ہاتھ میں ڈگری لئے ہوتے ہیں۔خود اعتمادی یا کوئی ہنر ہاتھ میں نظر نہیں آتا۔اس کی سب سے بڑی وجہ نوجوانوں کی ڈگریوں کی پیچھے دوڑ ہے۔نوکری میں رکھنے والے اگلے بندے کو پڑھتے ہیں نہ کہ اسکی ڈگری کو اور بے شک اسکی ڈگری انکی ملازمت نہیں کرے گی ملازمت کرنے والا تو سامنے بیٹھا ہوتا ہے۔ناکامی کا جائزہ لینے پر کیا خوبصورت بات کہی تھی کہ ہم اپنی ناکامیوں کا خود کو مجرم قرار دیں گے تو بہتر سیکھ پائیں گے۔دوسروں کو اپنی ناکامیوں کا دوش دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔

بڑا خواب دیکھنا کوئی غلط کام یا گناہ نہیں بس بڑا خواب دیکھتے ہوئے حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو ہمیں حدود معلوم ہو سکتی ہیں۔ٹارگٹ زندگی کا بہت اہم حصہ ہے ٹارگٹ تھا تو ہم سیکھنے کے لئے تقریب کا حصہ بننے گئے اور سیکھنا اگر نہ ہوتا تو سو بہانے ہمارا راستہ کاٹ دیتے۔ دوستوں کے متعلق جناب نے بتایا کہ دو طرح کے دوست ہوتے ہیں ایک personal اور دوسرے professional پروفیشنل والے آپکو آپکے پروفیشن میں مدد کرتے ہیں اور پرسنل والے آپکی زندگی کے اہم فیصلوں میں آپکی مدد کرتے ہیں تو ثابت ہوا ہماری زندگی میں دوستوں کی بہت اہمیت اور ضرورت ہے۔

نشست کا اختتام نہایت ہی خوبصورت رہا۔سب نے بھرپور شرکت کی۔اور سر سلمان عابد صاحب کا شکریہ ادا کیا اس کے بعد شہزاد بھائی نے الوداع کہتے ہوئے کہا کہ اب نوید اسلم صاحب اور حذیفہ اشرف سر کو ایک کتاب "قانون کی حاکمیت" پیش کریں گے جو کہ میرے والدِ محترم قانون دان جناب صاحبزادہ اشرف عاصمی صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔اس کے بعد گروپ فوٹو بنایا گیا۔یہ دن بھی سوچ کے سفر کا یادگار دن بن گیا۔

مثبت عینک

مثبت عینک سے زندگی کو دیکھنے لگ جائیں تو یہ خوبصورت نظر آئے گی۔ ہمارا نظریہ ہماری سوچ ہمارے تاریک یا روشن مستقبل کا فیصلہ کرتی ہے۔کامیاب راہوں کے مسافر پکی نظر اور پکے ارادے کے ساتھ نظریں اپنی منزل پر ٹکائے ہوتے ہیں۔پہلی سیڑھی، پہلی ٹھوکر اور گرنے کے بعد وہ پہلا عزم انسان کی زندگی کا وہ استاد ہے جو ہمیں منزل تک پہنچا کر دم لیتا ہے۔

ہمیں ہمارا رہنما چننا ہوتا ہے اور وہ رہنما ہماری عقل ہمارا دل اور ہمارا ارادہ ہوتا ہے۔رہنما سے پہلے نیت کی بات کی جاتی ہے انسان کی نیت ہی اسے منزل دیکھاتی جاتی ہے

"ذوقِ سفر نہ ہوتو کوئی رہنما نہیں"

اس کے بعد پختہ ارادہ اور سوچ اُسے وہاں لے کر جاتی ہے اگر سوچ مثبت ہے تو ہی ایسا ممکن ہے۔

کوشش انسان کو بہتر سے بہترین بناتی ہے ایک منزل کو دیکھ چکے ہیں اور وہاں پہنچے کا ارادہ بھی کر چکے ہیں تو اس کے لئے صرف ارادہ ہی کام نہ آئے گا کوشش بھی کرنا ہوگی ہاتھ پر ہاتھ رکھے منزل کو تکنا بیوقوفی ہے۔

کوشش مثبت سوچ کی کھڑکیوں کے وہ قبضے ہیں جو منفی گھٹا سے کبھی بند نہیں ہوتے۔

ایک بزرگ سے کسی نوجوان نے سوال کیا کہ اس معاشرے میں جہاں سفارش، رشوت اور بدیانتی چلتی ہو وہاں انسان کوشش کر کے کیا کرے؟ بزرگ نے جواب دیا اگر تمہیں سو فیصد یقین ہو کہ تمہاری کوشش رائیگاں جائے گی تو بھی کوشش کرنا تم پر فرض ہے اور یہی توکل کی اصل صورت ہے قرآن کی آیت کا ایک مفہوم ہے کہ ''اور تمہیں وہی ملتا جس کی تم کوشش کرتے

ہو۔''

لفظ ''کوشش'' تہہ دار معنی رکھتا ہے۔اس میں عزم ہے حوصلہ ہے۔مثبت سوچ کی توانائی۔خوابوں کی خوبصورتی ہے آس ہے امید ہے الغرض اس میں زندگی کو زندگی کی طرح گزارنے کی ساری انرجی اور خوبصورتی موجود ہے۔جس انسان کی کوشش ثمر آور نہیں ہوتی تو اسے وہ اپنی ناکامی تصور کرتا ہے۔ناکامی کا احساس منفی سوچ ہے۔اور منفی سوچ انسان کے اندر موجود صلاحیتوں کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہیں۔ہر حال میں مثبت سوچ رکھنے والا انسان ناکامی کو اس سارے عمل کا حصہ سمجھتا ہے جو وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہوتا ہے۔یہی مائنڈ پاور ہے کہ آپ کس انداز میں چیزوں کو دیکھ کر اپنے لئے دنیا کی تصویر میں خود رنگ بھرتے ہیں۔ہماری سوچ کامیاب اور ناکام لوگوں میں فرق کیسے کرتی ہے اور ہمارا معاشرہ ہماری سوچ اور ہم اس وقت کتنے پانی میں ہیں یہ عادتیں کامیاب اور ناکام افراد کے درمیان فرق واضح کر دیں گی۔

1۔ناکام لوگ ہر وقت اعتراض کرتے ہیں اور دل میں کینہ رکھتے ہیں، جبکہ کامیاب لوگ تعریف کرتے ہیں دوسروں کو معاف کرتے ہیں۔

2۔ناکام لوگ تبدیلی سے گھبرا جاتے ہیں،لیکن کامیاب لوگ تبدیلی کو گلے لگاتے ہیں گھبراتے نہیں ہیں۔

3۔ناکام لوگ ہر معاملے میں خود کو حقدار سمجھتے ہیں، جبکہ کامیاب لوگ ہر حال میں شکر گزاری کرتے ہیں۔

4۔ناکام لوگ اپنی ناکامی کا الزام دوسروں پر لگاتے ہیں،لیکن کامیاب لوگ ایسا نہیں کرتے بلکہ اپنی ناکامی کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔

5۔ناکام لوگوں میں کچھ نیا سیکھنے کا جذبہ نہیں ہوتا جبکہ کامیاب لوگ ہمیشہ کچھ نیا سیکھنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔

6۔ناکام لوگ دوسروں کی ناکامی پر خوش ہوتے ہیں کیونکہ وہ دوسروں کی کامیابی نہیں دیکھنا چاہتے، لیکن کامیاب لوگ دوسروں کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو ان کی رہنمائی بھی کرتے ہیں۔

7۔ناکام لوگ بے مقصد زندگی جی رہے ہوتے ہیں انہیں سمجھ نہیں آتا کہ وہ کیا چاہتے ہیں، جبکہ کامیاب لوگ منصوبہ کے ساتھ ہر کام کو انجام دیتے ہیں اور اپنے مقاصد کو پورا کرنے کی جی توڑ کوشش کرتے ہیں۔

8۔ ناکام لوگ دوسروں سے معلومات چھپاتے ہیں یہ سوچ کر کہ کہیں وہ ہم سے آگے نہ نکل جائیں، لیکن کامیاب لوگ دوسروں تک معلومات پہنچاتے ہیں کیونکہ علم باٹنے سے گھٹتا نہیں بلکہ بڑھتا ہے۔

ہمیں آگے بڑھنے کے لئے معاشرے میں ایک مقام پانے کے لئے مثبت عادتوں کو اپنانا ہوگا۔

خود کو راستہ دیکھانے کے ساتھ دوسروں کی بھی رہنمائی کرنا ہوگی۔جو سپورٹ چاہتے ہیں انکو منزل تک پہنچانے کے لئے ہماری مدد درکار ہوگی۔اور بے شک اسکا ہمیں اجر وثواب ملے گا۔اگر اللہ کریم نے انسان کو کسی بھی ہنر سے نوازا ہے اور وہ اس پر سانپ بن کر بیٹھا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی یہ خوبی یہ صلاحیت اسی تک محدود ہو جائے تو وہ منفی سوچ کا حامل چھوٹا انسان ہے۔انسان کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کو سنوارے ان کا حوصلہ بنے ان کی طاقت بنے انکو آگے بڑھنے میں مدد دے۔کم ظرف انسان دوسروں کی کامیابی سے جل کر اندر ہی اندر کمزور ہو جاتے ہیں۔جب کہ مثبت ذہن اور مثبت عینک والے افراد دوسروں کی بڑی خامیاں نظر انداز کر کے ان کی چھوٹی چھوٹی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہیں تا کہ ان میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ توانا ہو جائے ایسی مثبت عینک کی دنیا کے ہر معاشرے کو ضرورت ہے جو عیب کی بجائے خوبی دیکھے. تا کہ نسل نو کے اندر کو طاقت بخشی جا سکے تا کہ اسکو دلدل میں دھکا دیا جائے۔

ہاں میں یہ دنیا بدل سکتا ہوں

میرا آپ کا سب کا ہے کہنا کہ میں یہ دنیا بدل سکتا ہوں...

امن کا پرچم لے کر اٹھو ہر انساں سے پیار کرو

اپنا تو منشور ہے جالب سارے جہاں سے پیار کرو

روز وشب کا عروج وزوال ہر روز سوال بن کر کسی نہ کسی صورت میرے سامنے آجا تا ہے۔اس وقت میں خود سے سوال کرتا ہوں، کیا میں یہ دنیا بدل سکتا ہوں۔ یہ سوال پوچھنے کی دیر ہوتی ہے کہ میرے اندر سے ایک آواز آتی ہے ہاں تو دنیا بدل سکتا ہے۔ہاں میں دنیا بدل سکتا ہوں۔دنیا بدلنے سے پہلے ہمیں اپنے ملک کو بدلنا ہوگا ملک کو بدلنے کے لئے معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی اقدار پر کام کرنا ہوگا ۔ ہمیں ہر اس نظام کو خیر باد کہنا ہوگا جو ہمارے ملک کی بنیاد کو کھوکھلا کررہا ہے۔

میں بے روزگار لوگوں کو ہاتھ میں ڈگریاں لیے بے یارو مددگار ٹھوکریں کھاتا دیکھتا ہوں تو میرا ضمیر مجھے جھنجھوڑتا ہے، ملامت کرتا ہے۔تب میرے دل سے صدا نکلتی ہے کہ مجھے اس دنیا کو اس سنسار کو بدلنا ہے۔ میں یہ دنیا بدل سکتا ہوں۔

میں دنیا کے ابتر حالات اور دم توڑتی سسکتی انسانیت کو دیکھتا ہوں تو سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ کہنے کو تو گلی محلے شہر اور دنیا کا ہر فرد یہ عظیم جملہ بول سکتا ہے کہ وہ دنیا بدل سکتا ہے۔مگر اس دل فریب نعرے کو حقیقت کا روپ کیسے دیا جاسکتا ہے۔مایوسی کے اس عالم میں جب امید کے دیے بجھ رہے ہوتے ہیں تو میرے دل و دماغ کے نہاں خانوں سے ایک چنگاری پھوٹ پڑتی ہے۔درس دنیا یہی ہے کہ نتیجے کی پرواہ مت کی جائے بس اپنے حصہ کی محنت کی جائے۔

میری آرزویں اُمنگیں میرے خواب مجھے یہ سوچنے پر مجبور کررہے ہیں۔میں آج یہ

سوال خود سے اور آپ سے اور ہر ذی نفس سے کرتا ہوں کہ کیا آج کا بچہ، آج کا نوجوان آج کی نسل کل کے معمار کی تعمیر کر سکے گا؟ جواب ملتا ہے نہیں۔

کیونکہ اس دنیا کا، مادیت پرستی کا نظام آج دنیا کے ہر معصوم کو شکاری بننے کا درس سکھا رہا ہے۔آج کا بے رحم سماج یہ بے دل اور ظالم معاشرہ ہر بچے کا بچپن نگلتا چلا جا رہا ہے جو ملک کا سرمایہ ہے یا جو کچھ کرنا چاہتا ہے . جناب والا بچہ امیر و غریب کا نہیں ہوتا . بچہ صرف بچہ ہوا کرتا ہے۔جس کو زندہ رہنے، آگے بڑھنے کے لئے ہوا پانی روٹی کے ساتھ تعلیم پیار اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

کسی معصوم کی غربت یا اس کے مادی اسباب کو اس کی ذہانت فطانت اور کامیابی کے راستے میں نہیں آنا چاہیے۔ ہر بچے کو آگے بڑھنے کا حق قدرت عطا کرتی ہے مگر یہ حق آج کی دنیا سلب کرتی چلی جا رہی ہے.

میرے دل سے پھر آواز آتی ہے کیا میں ایسا ملک بدل سکتا ہوں جہاں حالات اس قدر بدحال ہوں۔کیا میں ایسا ملک بدل سکتا ہوں جہاں معصوم و غریب کی عزت جاگیرداروں کے گھر کی لونڈی بن جاتی ہے۔کیا میں وہ ملک بدل سکتا ہوں جہاں آج بھی عورت اپنے حقوق کے لئے برسرپیکار ہے۔کیا میں ایسے ملک کو بدل سکتا ہوں جہاں غریب ہونا ایک گالی ہے . جہاں دولت کے پجاری ہوس کے پجاری طاقت کے پجاری زندہ انسانوں کو نوچ نوچ کر اپنی پیاس بجھا رہے ہیں. جہاں انسان رنگ نسل مذہب کے نام پر تقسیم در تقسیم ہے. جہاں موت سستی اور زندگی مہنگی ہے۔ جہاں انسان کا سب سے بڑا دشمن انسان خود ہے۔

مجھے اگلے قدم پر اس کا جواب مل جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ہاں میں یہ دنیا بدل سکتا ہوں۔ میں سفر کی صعبتوں مشکلوں سے گھبرا کر یہ راستہ جو امن کا راستہ ہے جو پیار کا راستہ ہے جو ترقی کا راستہ ہے جو خوشحالی کا راستہ ہے نہیں بدل سکتا ہے۔سارا زمانہ طرف ہو جائے تب بھی میں اپنا کام جاری رکھوں گا۔

بقول شاعر ؎

شکوہ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر ہے
اپنے حصہ کی شمع جلاتے جاتے

خود کو بدل کر اپنے ارد گرد کے لوگوں کی گندی، بدبودار اور تنگ سوچوں اور آنکھوں پر پڑی کالی پٹیوں کو ہٹانے سے یہ دنیا بدل سکتی ہے۔ یہ دنیا بدل سکتی ہے اگر ہر انسان صرف اپنی نہیں بلکہ دوسروں کی خوشی کا بھی سوچے۔ اپنا بھلا سب چاہتے ہیں۔ اپنی خوشی ہر انسان کو عزیز ہوتی ہے۔ مگر دنیا تب بدلے گی جب انسان دوسروں کی خوشی، سکھ میں خوشی تلاش کرے گا۔ جب بڑے غموں کا ماتم چھوڑ کر انسان چھوٹی چھوٹی ہزاروں خوشیاں ضائع ہونے سے بچا لے گا۔ انسان کی ترقی اسکی خوشی دولت اور مادیت پرستی سے نکل کر جس دن رشتوں کی ترقی پر آ گئی اس دن یہ دنیا بدل جائے گی۔ میں یہ کرنے کے لیے تیار ہوں ہر وہ انسان جو دنیا کو بدلا ہوا دیکھنا چاہتا ہے وہ میرا ساتھ دے تاکہ خوشیاں سکھ اور سکون کی دولت عام ہو جائے گھر سے معاشرے تک انسان کی سوچ کی پرواز کو بلندی عطا ہو جائے ہاں میں آج بانگ دہل یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں دنیا بدل سکتا ہوں۔ اگر آپ بھی اس عظیم مقصد میں میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں تو اٹھیے اور اپنے من کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے خود کو انسانیت کے لئے وقف کر دیں۔

آخر میں بس یہی کہوں گا

میرے ہاتھ میں قلم ہے، میرے ذہن میں اجالا
مجھے کیا دبا سکے گا کوئی ظلمتوں کا پالا
مجھے فکر امن عالم، تجھے اپنی ذات کا غم
میں طلوع ہو رہا ہوں تو غروب ہونے والا

☆☆☆

لالچ سمِ قاتل

زیادہ قوت، زیادہ دولت، زیادہ سُستی، زیادہ عزم وہمت، زیادہ نفرت، زیادہ بھوک، زیادہ لالچ اور زیادہ پیار وغیرہ جب یہ سب حد پار کر جائیں تو یہ زہر بن جاتے ہیں۔ انسان کسی حدتک ان سب کو قبول کر سکتا ہے۔ زیادہ کی لالچ انسان کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ ایک ہوس جنم لے لیتی ہے۔ انسانیت اور احساس کی مقدار زیادہ کی لالچ کے آگے پھیکی پڑ جاتی ہے۔ حرص انسان کو ''میں'' کے علاوہ سب بھلا دیتی ہے۔ حریص کبھی بھی سیر نہیں ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر پوری دنیا کا مالک بھی بنا دیا جائے پھر بھی فقیر ہی رہتا ہے۔

لالچ انسان کو ہلاک کرنے والی ایک اخلاقی بیماری کا نام ہے، جسکا لغت میں تمائل نفس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی کسی شئے کی شدید آرزو کرنا اور قرآنی اصطلاح میں بہت زیادہ توقع رکھنا اور لوگوں کے مال اور زندگی کے بارے میں حرص کرنا۔ شاید اگر حرص کا ''زیاد خواہی'' ترجمہ کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا لہذا زیاد خواہی اور لالچ باعث بن جاتی ہے اس بات کی کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے اس سے وہ لذت حاصل نہیں کر پاتا اور اس سے اور بھی زیادہ کی خواہش کرنے لگتا ہے۔ اور لالچی انسان ذلت وخواری کو اپنی زندگی کے بدلے خریدنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر اس سے عزت وکرامت انسانی دامن چھڑانے لگتی ہے۔

عقلمندی کے باب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ھشام سے فرمایا:

لالچ سے پرہیز کرو اور جو لوگوں کے پاس ہے اس کی لالچ نہ کرو۔ لوگوں کے مال سے حسد کرنے کے عمل سے پرہیز کرو۔ کیونکہ لالچ اور حسد تمام برائیوں کی کنجی ہے۔ جو عقل کو مفقود کر دیتی ہے انسانیت کو ختم کر دیتی ہے۔ آبرو لے لیتی ہے اور عقل کو مار دیتی ہے۔

لالچ، لالچی انسان کے نفس کو اپنے کنٹرول میں کر لیتی ہے اور اپنی اس خصلت کی بناء پر انسان لالچ کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے روایت میں آیا ہے کہ ''لالچ ہمیشہ کی غلامی ہے''۔

حرص انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے۔ کیونکہ حریص انسان دنیا کی لالچ زرقیت و برقیت میں اندھا ہو جاتا ہے اور اپنے ارد گرد خطرات کو نہیں دیکھ پاتا ہے اور ہر شئے کو جلدی حاصل کئے جانے کے نتیجہ میں ذلیل وخوار ہوتا رہتا ہے۔ حرص و لالچ انسان کی آبرو کو برباد کر دیتی ہے اور اسکی عزت جو دوسروں کے نظر گرا دیتی ہے۔ کیونکہ لالچی انسان اپنی لالچ کے حصول میں دنیاوی اور سماجی ملاحظات کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ اور طمع و حرص کی گلے میں بندھی زنجیر میں ہر سو ذلیل وخوار ہوتا رہتا ہے۔

ایک اور سچ بھی بتائے دیتا ہوں کہ حرص و لالچ انسان کو ذلیل وخوار کر دیتی ہے مختلف گناہوں اور رزالت میں ملوث کر دیتی ہے مثلاً جھوٹ، خیانت، ظلم اور اور دوسروں کا مال غضب کرنا۔ اگر انسان چاہے کہ خداوند کے حلال وحرام کو سامنے رکھ کر کام کرے تو کبھی بھی حرص کے معاملہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا ہے۔

مرحوم شیخ عبدالحسین خوانساری کہتے ہیں، کہ کربلا میں ایک عطار تھا جو بیمار پڑ گیا اسنے اپنا سارا مال و اسباب معالجہ کی غرض سے بازار میں فروخت کر دیا لیکن کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ تمام طبیبوں اور ڈاکٹروں نے ناامیدی کا اظہار کر دیا۔

کہتے ہیں ایک روز اسکی عیادت کے لئے اسکی منزل پر گیا کافی طبیعت خراب تھی اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا گھر کے سارے سامان سمیٹو اور بازار میں جا کر بیچ آؤ جو درھم و دینار ملیں اسے لا کر معالجہ پر خرچ کرو تا کہ سکون مل جائیگا، ٹھیک ہونا ہو تو ٹھیک ہو جاؤں یا دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔

میں نے کہا! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ اس نے ایک آہ بھری اور کہنے لگا: ہمارے

پاس بہت دولت تھی اور میرے ثروت مند ہونے کی وجہ یہ تھی جب کربلا میں ایک بار وبا پھیلی تو اطباء نے اس وبا کا علاج شیرازی لیموں کا پانی بتایا، لہذا لیموں کا پانی مہنگا ہونے لگا اور بڑی دقت کے بعد ملنے لگا۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی کہ اگر لیموں کی مصنوعی خوشبو تیار کر کے اسے پانی میں ملا کر بیچا جائے تو کافی آمدنی ہو جائیگی۔ میں نے یہ صورت اپنائی اور بہت جلد ہی کربلا میں صرف میری دوکان تھی، ہر طرف میرا ہی چرچہ تھا غرض اچھی خاصی دولت کمالی۔ لیکن زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ اس مرض میں مبتلا ہو گیا جو کچھ تھا سب بک گیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔اب آخر میں یہی چند چیزیں رہ گئی تھی کہا جا کر سب کو بازار میں بیچ آؤ یا صحت ہو جائیگی یا پھر اس موزی مرض سے نجات مل جائیگی۔

ایک حریص اور لالچی انسان کا اعتماد خدا سے زیادہ انسانوں پر ہوتا ہے وہ خدا پر توکل کرنے کی بجائے اپنی ساری خواہشات پوری کر لینا چاہتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو وہ حریصانہ نگاہ سے لوگوں کو نہ دیکھے، بلکہ اپنی ہر خواہش کے لئے سوائے خداوند کے کسی اور سے توقع یا لالچ نہیں رکھے۔

اگر انسان خواہشمند ہے کہ اسکا احترام ہو خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے مکمل استفادہ کر سکے اور اطمینان اور سکون کی زندگی گزارنا چاہے تو اسے چاہئے کہ لالچ سے دوری اختیار کرے اور حرص و طمع کو اپنے قابو میں رکھے، اپنے نفس کی لگام کو اپنے ہاتھوں میں پکڑے رکھے اور جو دوسروں کے پاس ہے اسے دیکھ کر اپنی حرص و لالچ کو بڑھاوا نہ دے۔

انسان دنیا کے اس عارضی بازار میں نہایت قلیل وقت کا راہی ہے اسے جلد یا دیر اس جگہ سے کوچ کر جانا ہے اس لئے اسکو چاہیے کہ اپنی تمام خواہشات نفسی کو لگام ڈالے۔انسان کی زندگی کا مقصد اتنا پیچ نہیں ہو سکتا کہ وہ ساری زندگی مال و زر کے پیچھے باولا ہو کر گزار دے۔ انسان اللہ کی تخلیقات میں سے افضل ترین مخلوق ہے۔اس لئے انسان کو اپنا آپ پہچاننا چاہیے تا کہ وہ دنیا کہ فرضی عارضی فریبوں میں نا آسکے۔ یہ دنیا بہت بڑی لالچ ہے جو انسان کی رنگینی

میں کھونے لگے اسکو پھر کہیں پناہ نہیں ملتی۔اس لئے انسان کو اپنا دل دماغ کھلا رکھ کر اللہ کی مخلوق سے محبت کرنی چاہیے دوسروں کی خوبیاں اور اپنے عیب نظر میں رکھنے چاہیے۔تاکہ اس کا دل صاف ہوتا چلا جائے اور اس سے تمام دنیاوی فریب وفراڈ نکل جائیں۔اور حرص ولالچ اور نفس کو قابو کیا جا سکے۔تب ہی انسان فلاح کا راستہ پا سکتا ہے۔جو آخری اور حقیقی راستہ ہے۔

لالچ کی کالی پٹی کو آنکھوں سے اُتارنا ہوگا اس کو دل سے نکالنا ہوگا اور اللہ کے خوف کو دل میں ڈالنا ہوگا۔تب ہی کامیابی انسان کا مقدر بنے گی، بصورت دیگر انسان رسوا ہی ہوگا۔

☆☆☆

ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت

احمد نے برسوں پہلے کہا تھا کہ

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

انسان جب تک خود صاحب اولاد نہیں ہوجاتا اور اُس کے بچے جوان نہیں ہوجاتے اُسکی زندگی میں دوستوں کی دوستی کی چاشنی بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے پھر گھریلو مصروفیات زندگی کو اِس دور میں داخل کردیتی ہیں کہ انسان اپنے دوستوں سے رابطہ میں کمی کا شکار ہوجاتا ہے۔لیکن دوستی کے اِس جذے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔مولا علیؓ کا قول ہے وہ شخص غریب ہے جس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

انسانی جبلت میں ہے کہ وہ اپنی ذات کا اظہار چاہتا ہے۔انسان کے اندر چاہے جانے کا جذبہ بدرجہ اُتم موجود ہوتا ہے۔انسانی زندگی میں خواب بھی اُتنے ہی ضروری ہوتے ہیں جتنا خود انسان کی اپنی ذات۔انسانی زندگی میں جو رشتے جز ولاینفک ہیں اُن میں والدین بہن بھائی بیوی بچے وغیرہ وغیرہ۔مجھے آج انسانی زندگی کے جس رویے پر بات کرنی ہے وہ ہے انسان کی زندگی میں دوستی کے رشتے کی فعالیت۔

انسان اپنا بچپن بہن بھائیوں کے ساتھ کھیل کود کر گزارتا ہے لیکن زندگی کے اِس دور میں بھی وہ زیادہ اطمینان اُس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔یوں اُس کی اپنے ہم جماعت ساتھیوں کے ساتھ دوستی ہوتی ہے۔عموماً بچے کا میلان دوستی

اُس بچے کی جانب ہوتا ہے جو اُسے اپنے ساتھ کھیلاتا ہے اُس کے ساتھ برابری کی بنیاد پر سلوک کرتا ہے۔ جو بچے اپنے ساتھی ہم جماعتوں کو تنگ کرتے ہیں مارتے پیٹتے ہیں اُن سے پھر دوستی کے خواہشمند کم ہی ہوتے ہیں۔ اِس لیے ضروری ہوتا ہے کہ والدین اپنے بچوں کی آغاز سے ہی اِس طرح تربیت کریں کہ وہ اپنے ہم عمر ہم جماعت بچوں کے ساتھ اچھے انداز میں پیش آئیں۔ اور وہ اچھے طالب علم ثابت ہوں۔ انسانی زندگی کا یہ نفسیاتی پہلو ہے کہ بچے کو اگر بچپن میں کسی خاص شے کا نام لے کر ڈرایا جاتا رہا ہو یا بچے کو کسی خاص انداز میں پکارا جاتا رہا ہو جو اُس کے مزاجِ سلیم پر گراں گزرتا ہو تو اُس رویے کی وجہ سے بچہ ساری زندگی اُس طرح کے رویوں سے شاکی ہو جاتا ہے اور اُس کے اندر ایسے رویوں کے حوالے سے منفی جذبات انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ اِسی طرح اگر بڑے بھائی بہن بچے کو تنگ کرتے ہیں یا کسی طرح چھیڑتے ہیں یا اُس کو مارتے پیٹے ہیں تو وہ بچہ اُن بہن بھائیوں سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں بچے کو ایسے دوست کی ضرورت ہوتی ہے جو اُس کی بات سُننے اُس سے محبت کا اظہار کرے اور اُسے حوصلہ دے اور اُس کے ساتھ چاہت کرئے۔ یہ وہ جذبہ ہے جس سے چھوٹا کیا، بڑا کیا سب کا آپس میں دوستی کا ایسا بندھن قائم ہوجاتا ہے اور اُس انمول تعلق کی آبیاری پھر حالات و واقعات کے گزرنے کے ساتھ ساتھ جاری وساری رہتی ہے۔

ایسے بچے جن کے والدین، والد یا والدہ میں سے کوئی ایک فوت ہو جاتا ہے ایسے بچے کے اندر بھی چاہے جانے کی تڑپ بہت ہوتی ہے۔ عام لوگوں کے رویوں سے نالاں ہو کر اور ماں یا باپ کی کمی کی وجہ سے محبت اور چاہے جانے کے جذبے کی طمانیت کا حصول دوستی کے انتہائی مضبوط بندھن میں باندھ دیتا ہے۔ پھر یہ خلوص، کمتری کے احساس میں کمی لاتا ہے اور دوست کی دوستی پر ناز کیا جاتا ہے اور اِسی دوستی کی بدولت انسان اپنے اندر توانائی، خوداعتمادی محسوس کرتا ہے اور ایسا انسان دُنیا میں عام بچوں سے عادات وخصائل کے حوالے سے مختلف ہوتا ہے۔ توجہ یا محبت سے محروم بچے کی زندگی میں مخلص دوست کا ہونا درحقیقت اُس کی زندگی کو بدل

کر رکھ دیتا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں نفسا نفسی کا عالم ہو اور دولت کی ہوس نے رشتوں کے تقدس کو گہنا دیا ہو ایسے میں کسی انسان کے ساتھ بغیر کسی لالچ کے دوستی کا تعلق قائم رکھنا یقینی طور پر کافی مشکل کام ہے۔

دوست اور دوستی بہت مقدس احساس کا نام ہے۔ یہ دنیا میں وہ پہلا رشتہ ہے جو انسان اپنے ذہنی شعور اور عقل کی بنیاد پر کرتا ہے۔ دنیا میں انسان کو تمام رشتے من چاہے ملتے ہیں۔ مگر دوست وہ خود بناتا ہے۔ یہ رشتہ خون رنگ نسل مذہب اور قوم سے تعلق نہیں رکھتا۔ اسکو قبیلہ شہر ملک میں بانٹا نہیں جا سکتا۔ نا اس کا تعلق عمر شکل صورت یا قد کاٹھ سے متعلق ہے۔ یہ رشتہ انسان خود بناتا ہے اور اس کا واحد مقصد ایک ایسے ہم درد غم گسار اور پر خلوص فرد کی تلاش ہوتا ہے جو انسان کے ساتھ بنا کسی بھی ذاتی مالی فائدے یا نقصان کے ہر وقت کھڑا ہوتا ہے دوست کا احساس اتنا دلکش ہے کہ اسکو لفظوں میں مقید کرنا آسان نہیں۔ دوست دوست سے کسی بھی قسم کے مفاد یا منفعت کے بغیر ملتا ہے۔ اس کی خاطر دن رات ایک کر دیتا ہے۔ اس لئے انسان ایک سچے دوست کی تلاش کبھی ترک نہیں کرتا۔

فی زمانہ تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ اِس رشتے میں اب وہ طاقت نہیں ہے، لیکن اگر توجہ سے محروم بچے کے ساتھ کسی بچے کی دوستی مخلص بنیادوں پر ہو۔ تو وہ بچہ جو کہ خود کو دوسروں سے کم تر سمجھتا ہے وہی بچہ دوستی کے جذبے سے ملنے والی طاقت سے اپنی جبلت میں وہ تبدیلیاں بپا کر دیتا ہے کہ وہ معاشرے کا نا صرف ایک فعال رُکن بن جاتا ہے بلکہ اپنے ہم عصر ساتھیوں میں سے زیادہ ممتاز ہو جاتا ہے اور اُسکی نفوس پذیری عام انسانوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے دوست بنائیں اور ایسے افراد کو دوست کا شرف بخشیں جو دوست کے معانی سے آشنا ہوں جن کے دل نفرت و کدورت سے پاک ہوں ۔ جو آپ کا ہمیشہ اچھا چاہیں۔ کم ظرف کی دوستی کبھی نا

اپنائیں۔ورنہ وہ آپ کے اندر کا ہنر بھی چاٹ جائے گا ۔دوست انسان کا باطن ہوتے ہیں اس لئے انتخاب کرتے وقت دولت ومنصب نہیں بلکہ انسان کو جانچیں تا کہ آپ کبھی گھاٹے میں نا رہیں۔

☆☆☆

ہم بھی مہذب ہیں؟

پاکستانی سوسائٹی کے اندر اِس وقت جو عجیب طرح کی بے حسی جو پنپ رہی ہے اُس کے محرکات میں ایک اہم عنصر قانون پر عمل پیرا نہ ہونا ہے۔قانون توڑنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ قانون کی پیروی کر لیتا ہے تو گویا اُس کی ہتک ہوجاتی ہے ۔ اِس سوچ اور رویے کا جب ہم عمرانی،نفسیاتی اور سماجی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں تو حیرت انگیز طور پر ہماری سوسائٹی میں قانون توڑ کر تفاخر پایا جاتا ہے۔ انگریز کی حکومت میں اور ہندوؤں کی عملداری کی وجہ سے اٹھارہ سو ستاون سے لے کر اُنیس سو سینتالیس تک کا نوے سالہ دور برصغیر پاک وہند کے مسلمانون کو ایک مختلف سی ذہنی کشمکش میں مبتلا کر گیا۔

جس سوسائٹی میں انصاف کا خون ہوگا وہاں جبر اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوگا، جس معاشرے میں قانون کی بالا دستی نہیں ہوگی وہاں ظلمت کا راج پنپے گا۔دین فطرت اسلام کی تمام تر تعلیمات جو کہ نبی پاک ﷺ کے توسط سے اُمتِ مسلمہ کو نصیب ہوئیں اُن کا تو اول و آخر نچوڑ ہی محبت اخلاص انصاف، رواداری ہے۔ جو معاشرہ پاکستان میں جنم لے چکا ہے یہاں تو اُس کی بدولت نہ تو کسی عزت محفوظ ہے اور نہ ہی کسی کو انصاف تک رسائی ہے انصاف صرف اُس کو ملتا ہے جس کے پاس پیسے ہیں یا ڈنڈا، گویا وہ اصول یہاں بھی فروغ پا چکا ہے کہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔

زمین اور آسمان کبھی نہیں مل سکتے۔نفی اور جمع میں ہمیشہ سے تضاد رہا ہے۔انسان اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بعض اوقات اس طرح کے قدم اٹھانے لگ جاتا ہے۔جس سے اُس کی شخصیت کے سارے دم خم سامنے آجاتے ہیں۔علم دوستی کا رواج تو بہت

ہے لیکن جدید تعلیم کے تقاضوں کو اُس طرح اہمیت نہیں دی جا سکی جس طرح اس کی اہمیت تھی۔ انسانی ترقی میں وسائل کی ترقی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ایسے معاشرے میں جہاں دنیا کی تمام نعمتیں یعنی چار موسم ہیں۔ پہاڑ ہیں،معدنیات ہیں، دنیا کا بہترین نہری نظام ہے۔ان کے ہوتے ہوئے بھی پوری دنیا میں کشکول لے کر گھومنے کا مطلب یہ ہے کہ خودی کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

کسی نے نام نہاد جمہوریت کے نام پر اور کسی نے مذہب کے نام پر عوام کے خون کو چوسا ہے۔اب ہم یہ بات ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکتے ہیں کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں قیادت کی شدید کمی ہے۔ جو لوگ قوم کی قیادت کے اہل ہیں اُن کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ وہ مروجہ سیاسی نظام میں اسمبلی کے ممبر بن سکیں۔موجود تعفن شدہ معاشرے میں انسانی حقوق اور سماجی انقلاب کی دعویدار مذہبی وسیاسی قیادتیں خود ہی سماج کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ان قوتوں نے ہمارے معاشرے کو یرغمال بنا رکھا ہے۔زندگی اتنی اجیرن کہ ریاست اپنے ہی شہریوں سے اس طرح نبرد آزما ہے۔ جیسے بھیڑ بکریوں کو ہانکا جاتا ہے۔کوئی بھی مذہبی جماعت اُس طرح ڈلیور نہیں کر سکی جس طرح کے اسلامی نظام کا دعویٰ کرتی ہیں۔سیاسی قیادتیں مصلحتوں کا شکار ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک غنڈہ قاتل، قبضہ گروپ کا سرغنہ اسمبلی میں بیٹھا ہے۔سیاست میں قدم رکھنے کے لیے جس کی لاٹھی اُسکی بھینس کا قانون ہے۔

کم وسائل رکھنے والا معاشرے میں شودر کی طرح دیکھا جاتا ہے۔حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی خاطر جان قربان کرنے کا دعویٰ کرنے والے ان کی سیرت پاک کو اپنانے کے معاملے میں صفر ثابت ہورہے ہیں۔ جو جتنا مرضی تبلیغ دین میں مشغول ہو جائے۔عمرہ و حج کر لے معاشرے میں اُن کی طرف سے کوئی بھی پسندیدہ عمل نظر نہ آئے،تو پھر یہ کیسا ایمان ہے کہ جو جھوٹ چوری ہیرا پھیری،ظلم ڈاکے کم ناپ تول سے نہیں روکتا مطلب صاف واضح ہے کہ معاشرے میں نفوذ پزیری کے حامل افراد اپنا کردار ادا نہیں کر رہے ہیں۔

اگر ہمیں اِس طرح کے مسائل کی جانب دھکیل دیا گیا ہے تو پھر یہ بھی ہماری نا کامی و بے بسی ہے کہ ہم سازشوں کا مقابلہ نہیں کر پا رہے اُلٹا اغیار کی ساشوں کا مہرہ ثابت ہو رہے ہیں۔ دین مبین، اسلام کی بنیاد کو چھوڑ کر دنیاوی مادہ پرستی کے حرص و لالچ میں ڈوب کر ہم عشق رسولﷺ کا دعویٰ تو کر رہے ہیں لیکن عاشق رسولﷺ ہونے کا عملی نمونہ کیوں نہیں بن پا رہے۔ اب اگر کوئی بھی مسیحا آئے گا تو وہ نرم سے نرم انداز میں خونی انقلاب کی سوچ کو پروان چڑھائے گا۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ قافلے میں ایک بھی حسینؓ کی طرح نہیں جو رسم شبیری ادا کرے اور قوم کو سماجی، ثقافتی، معاشی، عمرانی، نفسیاتی، غلامی سے نکال کر روحانی مزاج میں ڈھالے اور مسلم امہ کے قلعہ پاکستان کو صحیح معنوں میں پاکستان بنائے۔

☆☆☆

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

آٹھ مارچ کو منائے جانے والے یوم خواتین کے حوالے سے جب قلم بردار ہوں تو سمجھ نہیں آرہی کہ میں عورت کی آزادی کے حوالے سے مروجہ سوچ کو کیا کہوں۔عورت کی آزادی کو کیا معنی پہنائے جائیں۔عورت ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے بیوی ہے۔زمانہ جہالت میں عورت کو خاندان کے لیے شرمندگی کا باعث تصور کیا جاتا تھا اور عورت کو خاندان کی بدنامی کا عنصر سمجھا جاتا تھا۔عرب جو کہ زبان پہ بہت قادر تھے اور شاعری اُن کے گھر کی باندھی تھی وہ جس شخص کی کوئی بیٹی ہوتی تو وہ اُس کے ایک ایک اعضا کی نشاندہی کرتے اور لڑکی کا نام لے لے کر شاعری کرتے یوں بیٹیوں کے باپ یہ بے عزتی برداشت نہ کر پاتے وہ بچی کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیتے۔

لیکن اسلام کی آمد کے بعد دنیا میں عورت کو نئے معانی نئے مفہوم اور نیا رتبہ ملا. رب پاک نے عورت کو ترکہ میں سے حصے دار بنایا اور اللہ پاک نے قران مجید میں وراثت کی تقسیم کو تفصیل کے ساتھ ارشاد فرمایا۔عورت کو مرد کے لیے باندھی نہیں بلکہ اگر وہ ماں ہے تو اُس کے قدموں تلے جنت کو قرار دیا۔اگر وہ بیٹی ہے تو اچھی پرورش کرنے پر والدین کو جنت کی بشارت دی اور اگر وہ بہن ہے تو اُسکو عزت واحترام دیا اگر بیوی ہے تو اسکو شوہر کا لباس قرار دیا . اُس کو ہر قسم کی مالی مشکلات سے آزاد کروا کر مرد کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ وہ گھر کا معاشی نظم و نسق خود چلائے اور عورت گھریلو امور کو انجام دئے بچوں کی پرورش کرے اور معاشرے کو بہترین نسل تیار کر کے دے۔اسلام سے پہلے عورت کو انتہائی گھٹیا مخلوق کا درجہ دیا گیا۔ ہندو مذہب میں تو مرد کے مرتے ہی عورت کو بھی اُسکے خاوند کے ساتھ زندہ ہی جلا دیا جاتا جسے ستی کی رسم کہا جاتا ہے۔عورت کو

معاشرے میں غلام سے بھی بدتر حثیت حاصل تھی۔ گویا کہ عورت ہونا جرم تھا۔

نبی پاکﷺ نے عورت کی عظمت و تقدیس کو چار چاند لگا دیئے۔عورت کی آزادی کے حوالے سے مختلف آراء پائی جاتی ہیں لیکن راقم کے نزدیک صرف ایک بات ہی فی زمانہ بہت اہمیت کی حامل ہے۔عورت موجودہ حالات میں کمانے کے لیے گھر سے نکلتی ہے تو اُسے کن کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

یہ حالات اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ہیں اسلام نے تو سینکڑوں سال قبل ہی معاشی ذمہ داری مرد پر ڈال دی تاکہ عورت عزت واحترام کے ساتھ گھر کا نظم ونسق سنبھالے اور خوش وخرم پاکیزہ زندگی بسر کرئے اور معاشی پریشانیوں سے آزاد ہوجائے۔

ذرا تصور فرمائیں عورت جب معاشی سرگرمیوں کے لیے ملازمت بھی کرتی ہے پھر جب اُس کو گھر کے معاملات بھی دیکھنا پڑتے ہیں تو اُس کو دوہری مشقت کرنا پڑتی ہے۔ راقم یہاں عورتوں کی ملازمت کے خلاف بات نہیں کر رہا۔عورت کو کام ضرور کرنا چاہیے تاکہ معاشرے کے نظام میں روانی رہے لیکن عورت سے کام اتنا ہی لینا چاہیے جتنا یہ صنف نازک کر سکتی ہے۔ اُسے اذیت سے دوچار نہیں کر دینا چاہیے کہ وہ گھر اور دفتر کے درمیان فٹ بال بن جائے۔ اگر توازن رکھ کر عورت کو کوئی ایسا کام مل جاتا ہے تو اسے ضرور کرنا چاہیے۔عورت کو ہراساں کیا جانا معمول بن چکا ہے۔ گو خاتون محتسب کے ادارئے کا قیام صوبہ پنجاب کی حد تک عمل میں آچکا ہے۔

لیکن خود ہی غور فرمائیں کتنے فی صد خواتین جا کر اِس محتسب کے دفتر میں یہ درخواست دیتی ہیں کہ مجھے ڈیوٹی کی جگہ فلاں شخص نے ہراساں کیا۔عورت کی عزت واحترام کے لیے معاشرے میں روحانی انقلاب کی پھر سے ضرورت ہے وہ انقلاب جو نبی پاکﷺ کا عطا کردہ ہے تاکہ زمانے کی آنکھوں میں حیا ہو۔قوانین تو بے شمار ہیں اور مروجہ نظام میں قوانین پر عمل درآمد کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔خواتین کی آزادی کے حوالے سے دنیا بھر میں بے شمار

تحریکیں چل رہی ہیں اور بہت سی تنظیمیں بھی میدان عمل میں ہیں۔عورت کو مارکیٹینگ کے لیے بطور ماڈل نیم برہنہ پیش کرنا کونسی آزادی ہے اور اِس سے معاشرے کی کس طرح خدمت بجالائی جارہی ہے۔عورت کو باپردہ ہونے کا حکم اُس کے لیے قید نہیں بلکہ اُس کی عزت و ناموس کی حفاظت اور احترام کے لیے بہت بڑی سہولت اور عزت و تکریم کا مقام ہے۔ دنیا کے کسی معاشرے میں فحاشی کے حق میں وکالت کی جاسکتی، ہر مذہب عورت کی عزت و ناموس کو اعلیٰ و ارفعٰ مقام دیتا ہے۔اِس لیے جو خواتین خواہ وہ ملازمت پیشہ ہیں یا گھر کے انتظام وانصرام میں مصروف رہتی ہیں پردے میں رہنے سے اُن کے احترام میں بے حد قدر ومنزلت پائی جاتی ہے۔

دین نے جو حدود قیود معاشرے کے ہر فرد کے لیے مقرر کی ہیں اُن کے پیچھے نفسیاتی طور پر جو پہلو کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ کسی طور بھی کوئی بھی فرد فطرتی روش سے ہٹنے نہ پائے۔اللہ پاک ہر انسان کا خالق و مالک ہے اور اپنے بندے سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اُتنی محبت ستر مائیں مل کر بھی نہیں کرسکتی وہ خدا اپنی مخلوق کی بے عزتی بے حرمتی کیسے برداشت کرسکتا ہے۔اِس لیے فطرتی تقاضے اُسی صورت پورے ہو سکتے ہیں جب معاشرے کا ایک ایک فرد ایک دوسرے کی عزت و ناموس کو مقدم رکھے۔ نبی پاکﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ کے بندے کے دل کو دُکھانا کعبہ کو ڈھانے سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔عورت کی آزادی کی رٹ لگانے والے عورت کو جسم فروشی کی طرف لگاتے اور مالی مفاد حاصل کرتے ہیں کیا یہ آزادی ہے۔عورت کو اپنے مالی فائدے کے لیے بطور شوپیس، پیش کرنا کیا یہ آزادی ہے۔ پاکستانی معاشرئے میں خواتین کو بہت زیادہ مسائل کا سامنا ہے پرائمری تعلیم سے لے کر ثانوی و اعلیٰ تعلیم تک کے مواقع بہت کم ہیں۔ ملازمتوں کی کمی، ٹرانسپورٹ کے مسائل، معاشرتی اونچ نیچ امارت اور غربت کے درمیان خلیج کا حائل ہونا، جہیز کی لعنت وغیرہ۔عورت کو بطور پروڈکٹ سمجھنے کے عمل کی نفی کرنے کی از حد ضرورت ہے۔

اصلی اور حقیقی مسائل وہ ہیں جو اوپر بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اسلام میں عورت کا مقام بہت بلند ہے۔ ۔وہ اپنی مرضی ومنشا کے مطابق ہر کام ایک خاص حدود و قیود میں کرسکتی ہیں۔

ایسی ہی کچھ حدود و قیود اللہ نے مردوں پر بھی لاگو کی ہیں۔آج کی نام کی مہذب دنیا میں خواتین کا جس قدر استحصال کیا جا رہا ہے اسکی مثال شاید تاریخ میں کہیں نا ملے۔گھر کی ملکہ کو بازار کی رونق بنا کر اس کو نام نہاد آزادی کا جھنڈا تھما دیا گیا ہے .اسلامی معاشرے میں مرد و زن ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔دونوں مل کر زندگی اور رشتوں کی گاڑی کو کھینچتے ہیں تبھی ان سے جڑے سینکڑوں رشتے آگے بڑھتے ہیں۔آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم خواتین کو ان کے تمام جائز حقوق دیں تا کہ یہ معاشرہ مرد و زن کے درمیان اکھاڑا نا بنے بلکہ یہاں توازن قائم ہو.اور زندگی کی یہ گاڑی چلتی رہے۔

وہ لوگ ہم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے

ادب سورج، چاند اور ستاروں کی وجہ سے محدود نہیں ہے۔اس میں ایسے ایسے شاہکار موجود ہیں جن میں سے کچھ تو بظاہر خالقِ حقیقی سے جا ملے مگر روح ہمارے درمیان موجود ہے۔اور انکا نام صدیوں تک چلتا رہتا ہے۔ان شخصیات کا ادب میں کردار ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے بڑے بڑے ادیب اور خاص طور پر نوجوان انکے اردو ادب کے لئے جذبات اور احساسات کو محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ استفادہ بھی کرتے رہتے ہیں۔انکے الفاظ انکا انداز ہمارے وجود میں سرایت پا جاتا ہے۔ایک ایسا ہی سورج 17 جون 2020ء کو غروب ہو گیا مگر اپنی کرنیں ہمارے درمیان چھوڑ گیا۔میں بات کر رہا ہوں ایک منفرد طرز کے شاعر،اداکار، پاکستان ٹیلی ویژن کے سب سے پہلے نیوز کاسٹر،سیاست دان، نیلام گھر کے میزبان اور لاکھوں دلوں کی دھڑکن جناب طارق عزیز صاحبؒ کی۔اور نہایت افسوس کہ ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ادب کا یہ باب ختم ہو گیا۔

1964ء میں پاکستان ٹیلی ویژن نے سب سے پہلا چہرہ طارق عزیز کا دِکھایا تھا۔جناب اداکاری میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے انکی پہلی فلم کا نام "انسانیت" تھا جو 1967ء میں آئی تھی۔اس فلم میں کی گئی اداکاری نے لوگوں کے دل میں گھر کر لیا تھا۔پھر اسکے بعد ایک اور پاکستانی فلم "ہار گیا انسان" میں بھی اداکاری کے فرائض سرانجام دیے۔اس کے بعد مختلف مارننگ شوز اور مقامی پروگراموں میں بھی شرکت کرتے رہے۔خیراتی مقاصد کے لئے بھی انکا کردار مثبت رہا۔1996ء میں جناب پاکستان مسلم لیگ ن کے ممبر کے طور پر لاہور سے قومی اسمبلی کے لئے منتخب ہوئے۔کوئز شو نیلام گھر اور طارق عزیز شو کے پلیٹ فارم کو چار چاند لگانے

والے آج اس دنیا میں نہ رہے۔اس بات کا دکھ لاکھوں پاکستانیوں کو ہے۔ ہر کوئی خود کو یہ یقین دلانے میں ناکام ثابت ہو رہا ہے کہ اس شخص کے نام کے ساتھ اب مرحوم لکھنا ہوگا۔انکو چاہنے والے رنج وغم میں مبتلا ہیں۔

فیملی شو دکھانے والے یہ پہلے انسان تھے اور یہ بات کہتے ہوئے میری زبان ذرا سی بھی نہ لڑکھڑائے گی کہ ویسا شو اب کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ادب کو ملحوظِ خاطر رکھنے والے طارق عزیزؒ کی جان دار آواز انکا لہجہ انکا اخلاق،کردار انکا کام صدیوں تک بھلایا نہ جائے گا۔کاش کہ ایسا ہو جائے کہ دورِ حاضر میں چلنے والے ٹی وی پروگرامز بھی ادب کا پلو تھام لیں جو بے حیائی اب دیکھنے کو ملتی ہے وہ ختم ہو جائے،طارق عزیز صاحبؒ جیسے شوز کو ترجیح دی جائے۔مگر ایسا مشکل ہوگا کیونکہ یہ وہ دور آ چکا ہے جس میں ٹی وی ٹی آر پیز صرف ناچ گانوں سے ہی آیا کرتی ہیں جو پورے رمضان دن میں نعتیں اور رات کو گانوں کے مختلف پروگرامز کیا کرتے ہیں۔یہ لوگ صرف بے حیائی کو پروموٹ کرنا جانتے ہیں اور دوسری طرف طارق عزیز صاحبؒ کے شوز نے ملک پاکستان کو بہترین نام دیے ہیں ایسے نوجوان تیار کر کے دیے جو ملکِ پاکستان کا نام روشن کر رہے ہیں۔طارق عزیز صاحبؒ میں اردو ادب کے تمام لوازمات موجود تھے۔مجھے یاد ہے جب میں چھوٹا تھا تو انکے شو کو دیکھا کرتا تھا جب بھی شعر پڑھتے تھے وہ منفرد انداز میرے دل پر لگتا تھا اور میں بھی ویسا بولنے کی کوشش کرتا۔میرے ساتھ ساتھ ہزاروں بچوں کی اردو ادب میں دلچسپی کی وجہ طارق عزیز صاحبؒ ہیں۔

انکے پروگرام کا جب آغاز ہوتا تو سادہ مگر دم دار اینٹری ہوتی اور اللہ کا نام لینے کے بعد انکا سلام کرنے کا انداز منفرد تھا آپ سب نے بھی یہ سن رکھا ہوگا کہ ''دیکھتی آنکھوں، سنتے کانوں کو طارق عزیز کا سلام'' ان کا یہ انداز بہت مشہور ہوا تھا۔

ادبی لوگوں کا زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں صرف ہو جایا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ طارق صاحبؒ نے کتابیں بھی تخلیق کیں۔جن میں ان کے کالموں کے مجموعے کا نام "داستان"

ہے جبکہ پنجابی شاعری کے مجموعے کا نام "ہمزاد دا دکھ" ہے۔ انہی کا ایک شعر آج سب کو بہت رولاتا ہے کہ

ہم وہ سیاہ بخت ہیں طارق کہ شہر میں
کھولیں دکانِ کفن تو لوگ مرنا چھوڑ دیں

1997 کے الیکشن میں طارق عزیزؒ نے پاکستان کے موجودہ وزیراعظم عمران خان کو شکست دی تھی مسلم لیگ ن کے اس دورِ حکومت میں سپریم کورٹ کی عمارت پر چڑھائی کے واقعے میں ملوث ہونے پر انھیں عدالت عظمٰی نے سزا بھی سنائی تھی۔

طارق عزیزؒ لجنڈز میں شمار ہوتے ہیں افسوس آج 'ایک اور باہمت لجنڈ آج ہمیں چھوڑ گیا۔

طارق عزیزؒ کی وفات کی خبر آتے ہی سوشل میڈیا پر ہیش ٹیگ طارق عزیز ٹرینڈ کرنے لگا اور صارفین نے ان کے انتقال پر گہرے دکھ اور صدمے کا اظہار کرتے ہوئے نیلام گھر شو سے وابستہ اپنی یادوں کا تذکرہ بھی کیا۔

پاکستان کے وزیراعظم عمران خان نے طارق عزیزؒ کی وفات پر ان کے اہلخانہ سے تعزیت کرتے ہوئے اپنے پیغام میں کہا کہ وہ اپنے وقت کے آئیکون اور ٹی وی گیم شوز کی بنیاد رکھنے والے تھے۔ٹی وی میزبان اور اداکار رواسع چوہدری نے طارق عزیز کو یاد کرتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے اپنے پروگرام میں اگر کبھی کسی مہمان سے پروگرام کا آغاز کرنے کی درخواست کی تو وہ صرف طارق عزیزؒ سے ہی کی تھی۔ان کے مطابق اگر چہ ضعیف العمری کی وجہ سے مائیک تھامتے ہوئے طارق عزیزؒ کے ہاتھ کپکپا رہے تھے لیکن جیسے ہی کیمرہ آن ہوا ان کی وہی آواز بلند ہوئی جو ان کا ٹریڈ مارک بن چکی تھی۔

ایسی بہت سی پوسٹس اور ٹویٹس سوشل میڈیا پر گردش کرنے لگیں۔سب نے دکھ کا اظہار کیا۔اداکاروں اور میزبانوں نے اتنا بھی کہا کہ ہم طارق عزیز صاحبؒ کو دیکھتے اور سنتے ہوئے بڑے ہوئے ہیں ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

یہاں میرا ایک سوال ہے کہ اگر ان سے بہت کچھ سیکھا ہے تو اس پر عمل کیوں نہیں؟ ان کا سکھایا ہوا ایسا تو نہیں جو دکھایا جاتا ہے۔ہمیں ایسے پروگرامز کرنے چاہیے جیسے طارق عزیز صاحبؒ کرتے رہے۔ایک عزیز از جان دوست نے بتایا کہ وہ ایک بار نیلام گھر گئے وہاں کچھ لڑکوں نے شرارت کی تو طارق صاحبؒ نے اسی وقت ان کو باہر نکلوایا پھر پروگرام کا آغاز کیا۔اسے کہتے ہیں اصول پسند ایسا انسان جسے ہم گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر سن بھی سکتے ہیں اور پورا پروگرام دیکھ بھی سکتے ہیں۔

آج کے پروگرامز میں نیلام گھر کا ٹیکسچر تو دیتے ہیں مگر آزادی کا لیبل لگا کر۔اور پہلے عجیب حرکتیں تو کبھی نہ ہوتی تھیں جواب ہوتی ہیں۔موٹر سائکل،فریج،جنریٹر حاصل کرنے کے لیے بیٹیاں ناچا تو نہیں کرتی تھیں۔کس طرف جارہے ہیں ہم؟ خدارا اگر طارق عزیز صاحبؒ کو اپنا آئیڈیل مانتے ہیں تو ان کے جیسے کارنامے بھی کریں۔ان کا سکھایا کم ان کا دکھایا راستہ یاد کریں . تاکہ ہم ٹیلی ویژن کو لچر پن سے واپس طارق عزیزؒ کے عہد میں لیجا سکیں. ورنہ وہ وقت دور نہیں ہے جب ہماری آنے والی نسل ہم کو ادیب کی جگہ بھکاری محسوس ہوگی۔نوجوان بچے بچیاں اخلاق سے گرے غیر معیاری پروگرامز دیکھ دیکھ کر سیکھنے کی جگہ تباہ ہو رہے ہیں۔نئے اذہان لالچ سے بھر رہے ہیں کیونکہ ہم طارق عزیزؒ سے کچھ سیکھ نہیں پائے۔

ہم نے ان کے آئیڈیا کو چوری کیا اس میں گند ڈال کر میڈیا مارکیٹنگ کا سہارا لے کر آزادی اظہار کے نام پر فیملی شوز کے نام پر بیہودگی کا بازار گرم کر رکھا ہے۔افسوس ہمارا عہد روشن چند بھانڈ چرا کر ہماری نسلوں کو ٹھمکے لگانا سکھا رہے ہیں۔اور ہر ٹھمکا لگانے پر موٹر بائیک کا انعام ملتا ہے اور تب میز بان شوہر حضرات کے سامنے ان کی بیگمات اور باپوں کے سامنے ان کی بیٹیوں کو اپنے ساتھ بائیک پر جھولے دیتا ہے اور باپ بھائی اس عمل بد پر تالیاں بجا کر چالیس ہزار کی بائیک جیت کر ہنسی خوشی واپس اپنو سیٹ پر جا بیٹھتے ہیں۔اس قدر اخلاقی دیوالیہ کو اگر نا روکا گیا تو یہ ناسور سارے معاشرے میں پھیل جائے گا۔جب تک یہ گند ختم نہیں ہو جاتا ہم کو طارق عزیزؒ

کے عہد تک جانے کی کوشش جاری رکھنی چاہیے تا کہ ہماری نسلیں اپنی مٹی اپنی اساس سے جڑی رہیں۔اللہ پاک اس خوبصورت شخصیت کی مغفرت فرمائے آمین۔

لوگ اچھے ہیں بہت، دل میں اتر جاتے ہیں
اک برائی ہے تو بس یہ کہ مر جاتے ہیں

☆☆☆

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اٹھا

ملکوں قوموں اور افراد پر مشکل وقت، سختیاں اور مصائب آتے رہتے ہیں۔ جب وقت ابتلا آتا ہے تو کمزور افراد قومیں اور ملک مٹی میں دفن ہو جاتے ہیں۔ وقت کے ظالم تھپیڑے ان کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتے ہیں مگر اس وقت میں جب مشکل سر پر آ کھڑی ہو تب بولڑ جاتا ہے جو اپنے وجود اور بقا کی جنگ سینہ سپر ہو کر لڑتا ہے جو کمزور ہونے کے باوجود طاقت کے مراکز کے دانت کھٹے کرتا ہے اسی ملک قوم کا نام دنیا میں قائم و دائم رہتا ہے۔آج ہم اگر پاکستان کے حالات کو ابتر دیکھتے ہیں تو اس کے پیچھے اپنوں کا لالچ اور غیروں کی سازش شامل ہے۔ آج ہمارا چمن لہولہو ہے۔کلی کلی بے حال اور گلاب گلاب خون سے تر ہے۔ایک وقت جب لگ رہا ہے کہ شاید یہ وقت کسی کے ناپاک ارادے کی نظر ہو جائے گا۔ مگر تب وطن کے بیٹے بیٹیاں جانباز اس طرح ہمت جرات حوصلہ اور بہادری سے اس وطن کے افکار کو سینے سے لگا لیتے ہیں کہ دشمن پسپا ہو جاتا ہے۔

پاکستان ایک ترقی پزیر مگر عظیم ملک ہے۔ اس ملک میں خدا کی دی ہوئی ہر نعمت موجود ہے۔اللہ نے پاکستان کو بہت نوازا ہے مگر اس ملک میں جو آج سے کچھ عرصہ پہلے امن و سکون قائم تھا اس امن کی اب دھجیاں اڑ کر رہ گئی ہیں۔اس ملک میں غربت وافلاس، بے روزگاری، کرپشن، افراطِ زر، لوڈ شیڈنگ اور توانائی کے بحران کے علاوہ ایک اور بہت بڑا مسئلہ جو پاکستان کو لاحق ہے وہ مسئلہ دہشت گردی ہے، دہشت گردی اس ملک پر ایک لعنت کی طرح ہے۔اس لعنت کو ہم پاکستانی مل کر ایک قوم بن کر جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔آج دنیا بھر میں اور وطن عزیز میں مسلمانوں پر ہر قسم کی دہشت عام کر دی گئی ہے۔میں پوچھتا ہوں ایسا کیوں

ہے؟۔جب بھی یہ سوچا جاتا ہے کہ پاکستان کے حالات کب ٹھیک ہوں گے تو ایک ہی سوال کھڑا ہوتا ہے کہ جوحکمرانوں کو باہر سے پیسے ملتے ہیں یہ کہاں جاتے ہیں۔

ہم سوچتے ہے کے شاید پاکستانیوں پر یہ پیسے لگتے ہیں۔ مگر جب ہم جائزہ لیتے ہیں، گھروں سے نکل کر دیکھتے ہیں تو غریبوں کے پاس کھانے کو کھانا نہیں ہے پینے کے لیے صاف پانی نہیں ہے۔روزی کمانے کے لیے سامان نہیں ہے۔یہی ہم برسوں پہلے سے سنتے آرہے ہیں اورآج بھی یہی آوازیں ہمارے کانوں میں گونجتی ہیں۔ہم جب اپنے گھروں سے باہر نکل کر دیکھیں تو کہیں سے کسی بھوکے بچے کی آوازیں آتی ہیں تو کہیں بے بس ماں اپنے بھوکے بچوں کے لیے اُن کا پیٹ پالنے کے لیے بھیک مانگتی ہوئی نظر آتی ہے تو کہیں غریبوں و مفلس کے نادار بچوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

کہیں بچے اپنے ماں باپ سے الگ ہورہے ہیں تو کہیں کسی کا خاوند اپنے خاندان سے الگ ہورہا ہے تو کہیں بوڑھے ماں باپ اپنے جوان بیٹے کے انتظار میں ہیں تو کہیں کوئی نوجوان اپنے گھر جانے کے لیے بلکتا ہے۔تو کہیں میں لوگوں کے منہ سے یہ الفاظ سنتا ہوں کہ دہشت گرد آ گئے دہشت گرد آ گئے تو کہیں سے بم کی آوازیں آتی ہیں تو کہیں کسی مجلس میں گولیوں کی آوازیں گونجتی ہیں تو کہیں کسی مسجد میں بم پھٹتے ہیں۔

تو کہیں کسی مجمع میں گولیاں چلتیں ہیں۔دہشت گرد پاکستان کو اپنی دہشت میں رکھ کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستانی قوم کچھ نہیں کرسکتی پاکستانی ڈر جائیں گے مگر ان کی یہ سوچ غلط ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ پاکستان کے ابھرتے ہوئے سورج ہونہار بچے ابھی پاکستان کے لیے آواز بلند کریں گے۔

پاکستان ایک عظیم ملک ہے اور اسے عظیم تر ہم بنائیں گے یہ جو دہشت گرد ہر قسم کی دہشت پھیلائے ہوئے ہیں ایسا کیوں ہیں؟ اُن بچوں کا کیا قصور تھا جنہیں دہشت گردوں نے موت کے گھاٹ اُتار دیا وہ تو پاکستان کے آنے والا مستقبل تھے اُنہیں کیوں اُن کی ماؤں سے

الگ کر دیا گیا کیوں۔۔۔کیا دہشت گرد نہیں چاہتے کہ پاکستان میں ترقی ہو۔دہشت اور دہشت گردی کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ عوام کو ڈرا کر ان کے ذہنوں پر تسلط قائم کر لیا جائے پاکستان کا نکلتا ہوا سورج جس کا علامہ اقبالؒ نے خواب دیکھا تھا نہیں یہ وہ پاکستان نہیں ہے مگر ان دہشت گردوں کو نہیں معلوم کہ پاکستان کا مستقبل اندھیرا نہیں بلکہ روشنی ہے۔

وہ وقت دور نہیں جب پاکستان کو نہ ہی کسی کی غلامی کرنا پڑے گی اور نہ ہی کسی کے ٹکڑوں پر پلنا پڑے گا۔پاکستان کی ترقی خوشحالی اور عزت کا سفر بس شروع ہونے کو ہے۔

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ
اے لا الہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتارِ دل بھر آنا کردار کاہرانہ

ابھی پاکستانیوں میں پاکستان کے لیے جوش و ولولہ موجود ہے۔وہ اپنے سینوں میں پاکستان کو چھپائے ہوئے ہیں اور ان کو معلوم ہے کہ پاکستان کو ہم نے کس طرح دشمنوں سے بچانا ہے۔اور پاکستان سے دہشت گردی جیسی لعنت کو کیسے ختم کرنا ہے۔

پاکستان ترقی پذیر ملک ہے اور اسے مزید بلندیوں پر لے کر جانا ہم سب پاکستانیوں کا فرض ہے اور اللہ چاہے گا تو انشااللہ قائدِاعظمؒ کا مشن ضرور پورا ہو گا۔اور ہم پاکستان کو عزیم تر ملک بنائیں گے۔ پاکستان ایٹمی طاقت ہے کیونکہ اللہ پاکستان کے ساتھ تھا, ہے اور ہمیشہ رہے گا۔اگر اللہ اسلام یا پاکستان کے ساتھ نہ ہوتا تو آج پاکستان اب بھی غلامی کر رہا ہوتا۔اللہ چاہتا تھا اسی لیے پاکستان آزاد ہوا۔قائدِاعظمؒ نے فرمایا۔مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرزِحکومت کیا ہو گا؟ پاکستان کا طرزِحکومت کا تعین کرنے والا میں کون ہوتا ہوں۔مسلمانوں کا طرزِحکومت آج سے تیرہ سو سال قبل قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا تھا۔الحمدللہ قرآن مجید ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے

گا۔اسی لیے ہم نے پاکستان 14 اگست 1947ء کو قائدِاعظمؒ کی قیادت میں حاصل کیا تھا۔ ہمارے پیارے پاکستان پر کوئی بھی بُری نظر نہیں ڈال سکتا کیونکہ یہ میرا پاکستان ہے یہ ہم سب کا پاکستان ہے۔

دہشت گردوں کی سب سے بڑی ناکامی ان کی شکست یہی ہے کہ ملک کا بچہ بچہ آج بھی ملک کو عظیم تر بنانے کے خواب دیکھتا ہے۔آج بھی مائیں اپنے لختِ جگر وطن پر وار دینے کو ہمہ وقت تیار ہیں۔آج بھی بہنوں نے اپنے بھائیوں کو ملک پر قربان کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے۔ اب بھی بیویاں اپنے سہاگ وطن کے حوالے کر رہی ہیں۔اس ملک کا ہر وہ انسان جو فکرِ اقبالؒ کا وارث اور قائدؒ کے مقصد تخلیق وطن کو سمجھتا ہے وہ اس مٹی پر مر مٹنے کا عزم کیے ہوئے ہے۔وطن کے بیٹے اس کے جانباز مشکل ترین حالات میں بھی امید کا دامن تھام کر شمع روشن کر رہے ہیں۔ اس لئے ہماری غیروں کی امداد کے سہارے وطن کو کمزور کرنے کا مکروہ خواب دیکھنے والے ہمیشہ ذلیل وخوار ہوں گے۔اور یہ وطن دنیا کے نقشے پر امن سلامتی انسانیت کا جھنڈا اٹھا کر پہلی صف میں کھڑا ہوگا۔کیونکہ یہ شیروں کی سرزمین ہے یہ بہادروں کا مسکن ہے یہ جان نثاروں کی بستی ہے یہ غازیوں کا گھر ہے یہ شہیدوں کے لہو کا قرض ہے۔اس وطن کی پکار پر کروڑوں انسان اپنا تن من دھن قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔اس لئے اس کا برا سوچنے والے خود ہی نیست و نابود ہو جائیں گے۔اور یہ وطن روزِ حشر تک دنیا میں سر بلند رہے گا۔

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اُٹھا
تیرے بیٹے تیرے غازی تیرے جانباز چلے آتے ہیں

پاکستان ہمیشہ قائم رہنے کے لیے بنا ہے اور انشاللہ پاکستان تا قیامت قائم رہے گا۔
پاکستان زندہ باد, قائدِاعظمؒ زندہ باد۔۔۔!!!

☆☆☆

دانش کدہ عشق
(افسانہ)

کچھ راستے بہت کٹھن ہوتے ہیں۔مشکلات ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔انسان خود کے لئے مصیبتیں خود ہی تلاش کر کے لاتا ہے اور راہ پر بچھا دیتا ہے۔پھر سوچتا ہے کہ اس پر کیسے چلا جائے. اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس راہ پر چلنا دشوار ہے۔پھر صبر کرنا پڑتا ہے یا یوں کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ انسان یہ سب خود کو صبر سکھانے کے لئے ہی کرتا ہے۔

"اُف عمر یہ دیکھو میرا سر پھٹا جا رہا ہے مجھے دوالا دو میں سونا چاہتا ہوں"

عمر اُٹھا اور جا کر کچن میں اوپر والی الماری سے دوا والا ڈبہ نکال کر اس میں سے دوا لے آیا۔۔

"اب یہ دوا کیا سوکھی کھا جاؤں تا کہ گلے میں اٹک جائے تمہاری جان تو چھوٹے مجھ سے ایسا ہی ہے نا عمر؟ پانی بھی لے ہی آتے"۔۔۔علی شدید سر درد کی وجہ سے غصہ کر رہا تھا،وہ چڑچڑا ہو چکا تھا۔خیر عمر نے پانی لا کر دیا اور تب تک پاس بیٹھا رہا جب تک علی سو نہ گیا۔کچھ دیر اس کے پاس بیٹھنے کے بعد عمر نے علی کے تپتے ہوئے ماتھے کو چوما اور کمرے سے باہر چلا گیا۔باہر نکلتے ہی علی کے باؤ جی کو سلام کیا اور اپنے گھر کا رستہ لے لیا۔

عمر سوچوں میں گم گاڑی چلاتا رہا۔

اسے علی کے بیماری اور مشکلات سے قبل کے سہانے دن یاد آ رہے تھے . لیکن وقت کا پہیہ ایسا گھوما تھا کہ ہر چیز بدل گئی تھی.

"یا خدا اب آگے کیا ہوگا؟

عمر سفر کے سارے دورانیے میں صرف اتنا ہی بولا اچانک اس کا دھیان سڑک پر

پڑے لال رنگ کے بستے پر گیا اپنی نظریں وہی جمائے عمر نے گاڑی کی رفتار کو آہستہ کرنا شروع کر دیا۔اب عمر کی نظریں اس بستے پر تھیں۔وہ گاڑی میں بیٹھے پانچ منٹ تک اس بستے کو گھورتا رہا۔وہ سوچ رہا تھا اس بستے میں کیا ہو سکتا ہے؟

اتنا قیمتی دکھنے والا بستہ ایسے کیوں پھینکا جا سکتا ہے؟

کیا کوئی اسے بھول گیا ہے؟ یا یہ کسی دہشت گرد کی سازش ہے؟

لیکن اس ویرانے میں ایسی سازش کس کام کی؟

ضرور کوئی اسے جان بوجھ کر یہاں چھوڑ کر گیا ہے مگر اس میں ہوگا کیا؟

پیسے؟

کپڑے؟

یا کسی لاش کے ٹکڑے؟

کئی سوال اس کے ذہن میں اٹھ رہے تھے.اتنا سوچنا تھا کہ عمر بے اختیار بولا "نہیں۔نہیں۔۔۔۔میں نہیں جا سکتا"

مگر بے چینی اتنی تھی کہ اسے آخر کار رکنا ہی پڑا۔اللہ کا نام لے کر گاڑی سے اُترا مگر نظریں بستے پر ہی تھیں۔ڈرتے ڈرتے پاس گیا تو گاڑی کے پاس سے بلی کی آواز سے چونک گیا۔اللہ کے ذکر کو اور بلند کرتے ہوئے بستے کے آس پاس نمی ڈھونڈنے لگا کہ کہیں خون موجود تو نہیں۔

مگر جیسے ہی بستے کے اندر سے ہلکی سی آواز آئی تو عمر ہکا بکا ہو گیا پاؤں زمین پر جم گئے۔سردی کے موسم میں بھی پسینے آنے لگے۔مگر ہمت کر کے اس نے بستے کی گلابی رنگ کی زپ کو کھولا اور دیکھ کر دنگ رہ گیا۔اس لال رنگ کے بستے میں ایک بچہ موجود تھا۔جس کی عمر اندازے کے مطابق قریب قریب چھ یا سات ماہ ہوگی۔بچے کا رنگ سردی کی وجہ سے زرد پڑ چکا تھا۔عمر اس سوچ میں پڑ گیا کہ اسے پولیس کے حوالے کر دینا چاہئے یا نہیں۔مگر اس نے پولیس کی

لاپرواہی کے کئی قصے سن رکھے تھے۔ پھر وہ ان جھمیلوں میں پڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔عمر نے اس بستے کو بند کیا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھتے ہی بستے کی وہ گلابی زپ کو تھوڑا سا کھول دیا تاکہ بچہ با آسانی سانس لے سکے۔ وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی آس پاس نظر دوڑانے لگا کہ کسی نے اسے ایسا کرتے دیکھا تو نہیں.

کمرے سے گلاس کے گرنے کی آواز آئی۔ باؤجی آواز سن کر چوکنا ہو گئے اور بھاگ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولتے ہی دنگ رہ گئے. علی نیچے گرا ہوا تھا۔ باؤجی بھاگ کر علی کے پاس گئے اور زور زور سے چلانا شروع ہو گئے

علی بیٹے اُٹھو۔۔

" تمہیں کیا ہوا ہے تم کچھ بولتے کیوں نہیں۔تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

باؤجی بہت پریشان ہو چکے تھے۔

باؤجی کی بے چینی اتنی بڑھ چکی تھی کہ علی کے ہوش میں آنے تک ان کے ماتھے پر پریشانی کی سلوٹیں نہ ہٹنے والی تھیں۔

باؤجی کو یاد آیا کہ گلاس کے گرنے کی بھی آواز آئی تھی انہوں نے اسی پریشانی کے عالم میں دیکھا کہ کہیں شیشے کا گلاس ٹوٹ کر علی کے نا لگ گیا ہو.

باؤجی کی نظر علی کی ٹانگ پر گئی. اسکی ٹانگ سے خون بھی بہہ رہا تھا۔

باؤجی یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ فون اُٹھا کر عمر کو کال کرنے لگے۔ جب بھی نمبر ملاتے دوسری طرف سے جواب نہ آتا۔

تقریباً دس بار ایسا ہوا اور اس کے بعد کال مل گئی۔

"ہیلو میں بول رہا ہوں.. کہاں ہو؟... کس حال میں ہو؟... جلدی آجاؤ... علی کی طبیعت۔۔"

باوجی ایک ہی سانس میں بولتے چلے گئے.

میں ڈرائیور بات کر رہا ہوں" اسلم باؤجی کی بات کاٹتے ہوئے بولا"... صاحب جی ہسپتال کے

اندر گئے ہیں میں باہر گاڑی میں بیٹھا ہوں"

"ہسپتال؟... کیا ہوا؟"..باؤ جی نے کہا"... میری اس سے فوری بات کرواو بہت ضروری ہے۔"

ڈرائیور جلدی سے گاڑی سے نکلا اور فون کان کے ساتھ لگائے ڈاکٹر اشفاق صاحب کے کمرے کی طرف بھاگا کیونکہ ڈرائیور جانتا تھا کہ عمر صاحب اشفاق صاحب کے کمرے میں ہونگے کیونکہ اشفاق صاحب عمر صاحب کے خالو تھے۔

دروازہ کھلتے ہی عمر اور اشفاق صاحب نے اسلم کو دیکھا

"صاحب جی فون ہے"

"اسلم کیا ہوا تم بھاگ کر کیوں آرہے ہو اور فون پر کون ہے؟"

"صاحب جی علی صاحب کے دادا جی کا فون ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ میں فون گاڑی میں ہی بھول گیا تھا۔" عمر نے کہہ کر فون کان سے لگایا"... جی باؤ جی کیا حال ہے؟"

"عمر بیٹا جلدی آؤ علی گر گیا ہے اور خون بھی بہہ رہا ہے" دوسری طرف سے باؤ جی بولے

"خون؟ گر گیا؟ کیا ہوا کیا؟ باؤ جی میں ابھی آرہا ہوں"

عمر اتنا کہتے ہی اسلم سے کہنے لگا کہ جب تک میں نہیں آتا تم یہاں ہی رہو گے.

"خالو مجھے کچھ دیر کی اجازت دیں میں ابھی حاضر ہوتا ہوں"

یہ کہہ کر وہ گاڑی کی طرف بھاگا۔

وہاں باؤ جی رات کے اس پہر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ کبھی گیٹ کو دیکھتے تو کبھی لاش کی مانند پڑے اپنے لخت جگر کو۔ باؤ جی کی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے.

اللہ کا ورد کے علاوہ ابھی وہ کچھ کرنے سے قاصر تھے۔

جب اور انتظار نہ ہوا تو فون اُٹھا کر پھر سے عمر کو کال ملانے لگے۔

عمر گاڑی چلاتے وقت موبائل فون کی طرف دھیان نہ لا سکا۔
اسی اثنا میں باؤ جی کو بھی پریشانی کے باعث چکر آنے لگے۔
مگر وہ چکر اس وجہ سے واپس ہو لئے کہ باؤ جی نے گاڑی کے ہارن کی آواز سن لی تھی باؤ جی کو سکون کا سانس آیا اور کھڑکی کی جانب بھاگے اور سوچا ضرور عمر ہوگا۔
"بھاگو جلدی بھاگو دروازہ کھولو"
باؤ جی نے چوکیدار سے کہا.
چوکیدار نے بھاگ کر دروازہ کھولا عمر گاڑی اندر لے آیا اور بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچا تو علی کو زمین پر گرا دیکھ حیران رہ گیا اسے جلدی سے اُٹھایا اور گاڑی میں ڈالنے لگا۔
باؤ جی بار بار صرف اتنا کہتے رہے کہ دیکھ کر دھیان سے چوٹ بھی لگی ہے
کہیں پھر سے گر نہ جائے۔
"باؤ جی آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا آپ گھر بیٹھیں میں اسے لے کر جا رہا ہوں۔"
اتنا کہتے ہی عمر کی گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔
عمر کا سفر علی کے گھر سے لے کر ہسپتال تک انتہائی کٹھن گزرا تھا.
عمر نے اشفاق صاحب کو کال کی۔
"اشفاق صاحب ایک اور مریض لے کر آ رہا ہوں آپ ابھی نہ جایئے گا۔اور بچہ کیسا ہے؟"
"جی عمر بیٹا آ جاؤ میں ادھر ہی ہوں اور بچہ نہیں وہ بچی ہے اور خطرے سے باہر ہے۔"
"تھینک گاڈ۔۔۔"
عمر نے سکون کی گہری سانس خارج کی

رات کی تاریکی میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ایک لڑکی دور آسمان پر موجود چاند کو دیکھ رہی

تھی۔اُس چاند کی روشنی سے سارا صحن روشن تھا۔ہلکی ہلکی ہوا سائیں سائیں کی آواز کے ساتھ چل رہی تھی۔آنکھوں میں آنسو لئے وہ لڑکی کافی دیر تک یہ نظارہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتی رہی۔یوں لگ رہا تھا کہ وہ یہ سب اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لینا چاہتی ہو.وہ اپنی نظروں کو چاند پر ہی جمائے بیٹھی تھی جب ہی بادلوں میں کھینچا تانی شروع ہوئی اور چند لمحوں میں چاند ان کے پیچھے کہیں چھپ گیا . کون جانے چاند کس کے دکھ سے منہ چھپا بیٹھا تھا.

ہواؤں میں بھی تیزی آنے لگی اور زور زور سے چلنے لگیں.وہ اپنے خیالوں میں گم تھی اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور آگے کیا ہوگا۔

چاند اسکی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا اور اسے اس بات کا اندازہ بھی نہیں ہوا کہ وہی چاند جسے وہ پچھلے کئی وقت سے دیکھ رہی تھی اب وہ وہاں موجود نہیں تھا۔یوں لگتا تھا کہ جیسے اسکا ذہن کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا اور نظریں کہیں اور۔اُس کے ذہن میں کیا چلتا تھا وہ اپنے گھر والوں کو بھی نہ بتاتی تھی۔ان لمحات میں اسکی ماں دو بار آکر جا چکی تھی مگر اسے بھنک تک نہ لگی تھی۔اور اُس بیتے وقت میں اس نے خود سے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ "محبت کرنا تو کوئی جرم نہیں؟"۔اس کے اپنے ہی سوال نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

کچھ ہی لمحوں کے بعد بارش کی بوندوں نے بادلوں سے نکل کر چھلانگیں لگا دیں۔بادلوں نے بھی اپنے ہونے کا احساس دلانے کے لئے زور زور سے گرجنا شروع کر دیا۔معاً اس نے دوبارہ خود کو اسی جگہ پایا جہاں وہ رہتی تھی اب وہ اپنے خیالوں سے باہر آ چکی تھی۔ساتھ والے کمرے میں موجود ماں کے کھانسنے کی آواز سن کر وہ فوراً سے ماں کے پاس چلی گئی . جانے سے پہلے آنسوؤں کو صاف کرنا نہ بھولی تھی ماں کی آغوش میں سر رکھ کر صرف اتنا ہی کہہ پائی

"امی جان آپ ابا جان سے بات کیوں نہیں کرتے ؟

"میری جان تیرے ابا جی سے بات کرنا بے سود ہے وہ کسی کی نہیں سنتے تم تو جانتی ہو میری بچی۔"

"پر ماں میرا قصور تو بتائیں آپ لوگوں کی عزت رکھنا میرا فرض ہے مگر ایک بار یہ تو سوچا ہوتا کہ آگے جا کر حالات کیسے ہو جائنگے ۔ میں آپ کی بیٹی ہونے کے ساتھ ایک مکمل انسان بھی ہوں. جسکے کچھ جذبات بھی ہیں"

اقراء کے ابا نے سلیم بھائی جان کو زبان دے رکھی تھی کہ اقراء کا نکاح چچا سلیم کے بیٹے معاذ سے ہوگا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اقراء کی عمر کم و بیش 4 ماہ تھی اور آج اس بات کو تقریباً بیس سال بیت چکے تھے .اب حالات بدل چکے ہیں اقراء جوان ہو چکی تھی اور یونیورسٹی کی طالبہ تھی وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ دوسری سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا کرتی تھی ۔اسی دوران اسے اسکے جذبات و احساسات کو سمجھنے والا مل گیا تھا۔اسکی ناراضی اور غصے پر جان نچھاور کرنے والا .

علی،اقراء سے سینئر تھا۔ یونیوسٹی میں منعقد کردہ مشاعرہ میں انکی ملاقات ہوئی اورانہی کچھ لمحات میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نظر کے ساتھ ساتھ دل بھی ملا بیٹھے۔اقراء بہت حساس طبیعت کی لڑکی تھی وہ علی کے ساتھ گزرا ہر وقت یادگار بنانے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ وہ اسے اپنی دنیا سمجھ بیٹھی تھی مگر اسے کیا معلوم تھا کہ قدرت کو کچھ اور منظور ہونے والا ہے۔
ایک روز علی اور اقراء یونیورسٹی کے بعد علی کے گھر چلے گئے اس نے اپنے دوست عمر کو بھی گھر بلایا اور اتنا ہی کہا کہ جلدی گھر آؤ تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔گھر میں علی اور باؤ جی کہ علاوہ کوئی بھی نہ ہوتا تھا۔ باؤ جی علی کے دادا تھے علی کے والدین کچھ عرصہ پہلے ایک کار ایکسیڈنٹ میں مارے جا چکے تھے۔عمر گھر آیا باؤ جی اور عمر کو کہا کہ ماں باپ کے بعد آپ لوگوں نے میرا بہت ساتھ دیا ہے مجھے ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی آج آپ لوگوں کو ایسے انسان سے ملوانے والا ہوں جو مجھے میرے وجود کا احساس دلاتی ہے جو مجھے جینا سکھا رہی ہے۔یہ اقراء ہے اس سے میں یونیورسٹی میں ملا تھا۔عمر اور باؤ جی کے چہرے خوشی سے گلنار ہو گئے.
باؤ جی نے اُٹھ کر اقراء کے سر پر پیار دیا اور کہا" . بیٹا ہمیشہ خوش رہو۔"

عمر جھٹ سے بولا "بھابھی جی ہمارے لڑکے پر ایسا کیا جادو کر دیا۔۔۔"

اقراء کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ واضح دیکھی جا سکتی تھی۔

"مجھے علی میں وہ نظر آیا جو بچپن سے اب تک خوابوں میں دیکھا ہے۔"اقراء بولی". محبت دروازہ نہیں کھٹکھٹاتی وہ سیدھا اندر آ جایا کرتی ہے اور دل میں جگہ بنا کر اثر چھوڑنا شروع کر دیتی ہے۔

"واہ واہ واہ واہ واہ"۔۔۔۔۔۔عمر کو تو مانو واہ واہ کہنے کے پیسے دیے گئے تھے وہ واہ واہ کرتا چلا گیا۔

"چلو بھئی بس بھی کرو"۔۔علی بولا۔۔۔۔"۔اب آپ لوگ سمجھے میرے دل کو یہ کیوں بھا گئی۔"

"جی جی سمجھ گئے جناب شاعر صفت انسان کو محبوبہ بھی افسانوی ملی۔"

ہاہاہاہا وَ جی قہقہہ لگا کر ہنسے۔۔۔

"بیٹا خوش رہو اور اپنے گھر والوں سے بات کرو اور ہمیں گھر آنے کا شرف بخشو۔"

یہ سننا تھا کہ اقراء کے حواس باختہ ہو گئے وہ کچھ پل کے لئے جیسے صدمے میں چلی گئی.

علی اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اسے ہلا کر پوچھا کہ " کیا ہوا"

"نہیں کچھ نہیں۔۔۔علی گھر جانا ہے مجھے اب کافی دیر ہو چکی ہے۔"

"ارے ایسے کیسے"۔۔۔۔عمر بولا۔۔۔

"بھابھی جی کچھ کھا پی کر تو جائیں پہلی بار آئی ہیں۔"

"نہیں عمر بھائی ان شاءاللہ میں پھر آؤنگی۔"

"جی اچھا ٹھیک ہے۔"

علی اقراء کو چھوڑنے چلا گیا۔

گاڑی میں پھیلی مہیب خاموشی عجیب سا حبس پیدا کر رہی تھی۔

"اقراء کیا ہوا کچھ بولوتو سہی... باؤ جی اور عمر سے مل کر کیسا لگا؟... تمہیں پتہ ہے یہ لوگ ہی میری زندگی ہیں اور شرارتی لڑکی مجھے یہ تو بتاؤ یہ اچانک سے تمہیں کیا ہوا کہ گھر نہ رک سکی اور اپنے گھر جانے کی رٹ لگا لی۔۔۔۔ارے میں کب سے بول رہا ہوں اور تم چپ ہو... لو بھئی پتہ بھی تو چلے ایسی کیا بات ہے۔... نہیں بتانا؟"

اقراء علی کو سُن رہی تھی مگر اسکے معصوم چہرے پر چھائی اداسی دیکھی جاسکتی تھی۔ان کے اندر ایک طوفان موجزن تھا . وہ اپنے وجود میں بکھری لہروں کے تلاطم کو ٹھنڈا کر رہی تھی . وہ آنے والے وقت کا سوچ کر جیسے رک سی گئی تھی.

" ٹھیک ہے بھئی نہ بتاؤ میں بھی چپ ہو جاتا ہوں

آئندہ بولوں گا ہی نہیں"

یہ سن کر اقراء نے فوراً سے بیشتر اپنا چہرہ علی کی طرف کیا اور کہا" . علی نہیں تم ایسا نہ کرنا تم نہیں بولو گے تو کائنات خاموش ہو جائے گی ہر چیز بے سُری ہو گی یہ رنگینیاں ختم ہو جائینگی

الفاظ بے معنی ہو جائینگے تم ایسا مت کرنا. بولو جتنا بولنا ہے.... بولو میں سن رہی ہوں نا... پوچھو کیا پوچھ رہے ہو۔"

"ایک تو جب تم یہ پیارے پیارے بلکہ میٹھے میٹھے جملے بولتی ہو تو دل کرتا ہے سب غم بھلا دوں

اچھا یہ بتاؤ ہوا کیا ہے۔"

"علی تم گاڑی ذرا سائیڈ پر روکو میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں جو تمہیں بہت اطمینان سے سننا ہے۔"

ارے بھئی ایسا کیا ہے بتاتی جاؤ میں سن رہا ہوں".

"نہیں علی پلیز" اقرا نے اصرار کیا

"اوکے بابا یہ لو". علی نے گاڑی کو بریک لگائے اور ڈرائیونگ سیٹ کو ذرا سا پیچھے کھسکا کر بولا"... ہاں بابا اب بولو کیا بات ہے یہ لب کیا بولنا چاہتے ہیں"

"علی میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ عشق ایک ایسا مرض ہے جو لا علاج ہوتا ہے اور مجھے یہ مرض ہو چکا ہے مگر یہ مرض میرے لئے واقعی جان لیوا ہے۔" اقراء نے کہا.

"ہیں کیا مطلب؟ اقراء کیا کہنا چاہتی ہو کھل کر بتاؤ"

اقراء علی کو سب کچھ بتاتی چلی گئی اور علی اسے اطمینان سے سنتا رہا سب کچھ سننے کے بعد علی نے اقراء کو گھر چھوڑا اور عمر کو کال کی.

"عمر جانی کہاں ہے؟"

"بھائی گھر ہوں!"

"میرے گھر آ جا!"

"بھائی ابھی تو آیا تھا"

"بھائی آ جا ضرورت ہے تیری۔" علی کی آواز بھاری ہو چکی تھی

"میرے بھائی کیا ہوا ہے اچھا رک میں آ رہا ہوں۔"

کچھ ہی دیر میں عمر اور علی ایک ساتھ موجود تھے

"ہاں بھائی بول کیا ہوا؟" عمر نے گفتگو کا آغاز کیا.

"عمر تمہیں اقراء کیسی لگی؟"

ارے یہ بات تھی یار کال پر ہی پوچھ لیتا ضرور چکر لگوایا" عمر علی کے سوال پر حیرن ہوا تھا

"عمر میں سنجیدہ ہوں"

"اچھا اچھا۔۔۔ بھابھی بہت اچھی ہیں تیرے لئے ایک دم پرفیکٹ ہیں۔۔ مگر ہوا کیا؟"

"ہاں عمر پرفیکٹ تو ہے مگر وہ میرے لئے نہیں ہے۔"

"ہیں کیا ہوا کیا کہہ رہا ہے تو بول کیا رہا ہے؟... عمر حیران ہو گیا"... بھائی بتا مجھے۔"

علی نے عمر کو اقراء کی وہ سب باتیں بتا دیں جو اس نے اسے گاڑی میں بتائی تھیں۔ وہ باتیں سلیم کے بیٹے معاذ کے متعلق تھیں کہ ان کے گھر والے انکا فیصلہ انکے بچپن میں ہی کر چکے تھے۔

عمر غصے سے آگ بگولا ہوگیا
"اسکی اتنی ہمت جب یہ سب جانتی تھی تو تم سے محبت کا ڈھونگ کیوں رچایا؟... علی تم بھی بچے ہو کسی کی بھی باتوں میں آجاتے ہو۔"
"عمر میری بات تو سنو... یہ بات اقراء کو بھی کچھ دن پہلے معلوم ہوئی وہ کچھ دنوں سے سہمی سہمی رہتی تھی اسی لئے اپنے گھر لایا تھا کہ تم لوگوں سے ملے گی تو اچھا محسوس کرے گی۔"
"اچھا پھر کیا کرنا ہے اب...." عمر صوفے پر پالکی مارتے ہوئے بیٹھا"...اسے معلوم کیسے ہوا؟"
"اقراء نے کچھ دن پہلے ہی اپنی ماں سے ہمارے بارے میں بات کی تھی مگر یہ سب سنتے ہی اسکی ماں نے اقراء کو سب بتا دیا اور اقراء کے والد سے بات کرنے سے منع کر دیا۔عمر کچھ کر میں اس بغیر دنیا کے رنگ نہیں دیکھ پاؤں گا۔" علی بولا
"علی میری بات سنو اب ساری کوششیں بے سود ہونگی کیونکہ تم جان چکے ہو کہ اسکے والد ایسا کبھی نہ ہونے دینگے۔" عمر نے دوٹوک جواب دیا
"نہیں کرو کچھ تم کچھ بھی کر سکتے ہو" علی نے پر اعتماد لہجے میں کہا
"اچھا اچھا رکو کچھ سوچنے دو۔" عمر سوچ میں پڑ گیا.
لیکن وقت کے بے رحم پہیے نے دو معصوم دلوں کو چیرنے کا فیصلہ کر لیا تھا . وہ فیصلہ جس سے کتنی ہی زندگیاں تبدیل ہونے والی تھیں پر وقت کہاں کسی کے لئے رکتا ہے. بس بعض انسان کہیں رک جاتے ہیں اور کچھ انسان کھو جاتے ہیں.

گھر کا سارا نظام درہم برہم ہوا تھا سب ہاتھوں پر ہاتھ رکھے ٹوٹے سامان کو دیکھتے رہے اقراء گھر میں داخل ہوئی تو سب بکھرا دیکھ کر پریشان ہوگئی۔اقراء نے بمشکل حلق سے سانس اتارا اور کمرے میں چلی گئی۔
اور اپنے بابا کے چلانے کی آوازیں سننے لگی وہ اللہ سے دعائیں مانگنے لگی.

"یا اللہ سب خیر ہو۔تو سب جانتا ہے کہ کیا ہوا ہے۔ یا اللہ سب خیر رکھنا"

معاً اقراء کے بابا اسکی والدہ کا ہاتھ پکڑے کمرے میں داخل ہوئے اور کہا کہ

"لے تیری لاڈلی آ گئی پوچھ لے اس سے تجھے میری بات کا یقین نہ آئے گا۔"

اب اقراء کی والدہ کیا بولتی وہ تو سب جانتی تھیں۔اقراء ان سے اپنے دل کی بات بیان کر چکی تھی۔

اقراء ہمت کر کے بولی" . بابا کیا ہوا ہے؟"

" کیا ہوا ہے؟... یہ تو مجھ سے پوچھ رہی ہے۔خدا غارت کرے تجھے تو نے ہماری عزت مٹی میں ملا دی اور پوچھتی ہے کیا ہوا ہے؟"

اقراء آنسوؤں کو روک نہ پائی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زمین کو دیکھتی رہی۔

" محلے کے لڑکوں سے اب میں تیری رنگ رنگیلوں کے قصے سنوں گا؟"

"بابا یہ جھوٹ ہے یہ الزام ہے آپکو کسی نے غلط بیانی کی ہے۔خدا کہ لئے ایسا الزام نہ لگائیں".

"میں تیری شکل نہیں دیکھنا چاہتا دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے"

یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ اقراء کو بات سمجھنے کا موقع بھی نہ مل سکا . لیکن وہ اپنے گھر میں پرائی ہو چکی تھی .اس کے تمام جذبات کو ایک لمحے میں جلا دیا گیا تھا اس کو با کردار سے کب بد کردار بنا دیا گیا اسے معلوم ہی نا ہوا . وہ یہ سمجھ ہی نا پائی کہ محلے کے چند اوباشوں کے کہے سے اسکی قسمت اس کے بابا کیسے بدل سکتے ہیں؟ کیا ان کا یقین اتنا چھوٹا اور کم تر تھا جو کسی کی بھی بات سن کر بکھر گیا تھا . لمحوں نے اسکو صدیوں کے غم دے دیئے تھے . وہ صحراوں میں بھٹکتی ایک بے بس روح بن گئی تھی . جس کو اس کے اپنوں کی زبان کی لوٹ لیا تھا.

اُدھر علی اور عمر اقراء کے بابا کو کسی طرح منانے کے منصوبے بنا رہے تھے اور اِدھر دیکھتے ہی دیکھتے اقراء کے والد نے سلیم کے بیٹے معاذ سے اسکی سادگی سے شادی کروا دی۔

عمر ہسپتال کے اندر گاڑی لے گیا اور اندر جانے سے پہلے ڈرائیور کو کال کر کے باہر بلا لیا
وہ گاڑی سیدھا ایمرجینسی یونٹ کے باہر لے گیا علی کو جلدی سے سٹریچر پر لٹایا گیا عمر نے ڈرائیور کو کہا" جلدی سے گاڑی پارک کے آؤ۔"
علی کو اندر لے جایا گیا اور اشفاق صاحب ایمرجنسی وارڈ میں جاتے ہوئے نظر آئے
ڈرپ اور دو ایک انجیکشن لگانے کے بعد اشفاق صاحب عمر کے پاس آئے اور کہا" .تم پریشان نہ ہو معمولی سا زخم ہے سب ٹھیک ہو جائے گا"
"شکریہ خالو بہت شکریہ" عمر کے چہرے پر شکر آمیز مسکراہٹ تھی۔
"لیکن یہ سب ہوا کیسے؟..."اشفاق صاحب عمر سے اندر کی بات جاننا چاہتے تھے کیونکہ انہوں نے عمر کو ابھی یہ نہ بتایا تھا کہ علی کو ہوش بھی آیا تھا اور وہ ایک ہی نام بار بار دہرا رہا تھا اور وہ نام اقراء کا تھا۔
"چلو ادھر سے چلتے ہیں میں تمہیں بچی کے پاس لے کر چلتا ہوں جسے تم لے کر آئے تھے اور یہ سب بھی مجھے میرے کمرے میں جا کر بتاؤ"
عمر نے اسلم کو تلقین کی کہ یہاں سے ہلنا مت اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو تم فوری مجھے اطلاع کرو. یہ کہہ کر وہ اشفاق صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔
"خالو میں بچی کو دیکھنا چاہوں گا"
"ہاں عمر ادھر آؤ دکھاتا ہوں اس معصوم کلی کو تم بڑے صحیح وقت پر لے آئے تھے ورنہ بچے سردی کو برداشت نہیں کر پاتے۔"
"یہ اب بالکل خطرے سے باہر ہے نا؟"
"ہاں عمر اب تم بے فکر رہو اور مجھے ایک بات بتاؤ یہ اقراء کون ہے؟"
عمر حیران رہ گیا"...اقراء؟"
عمر کو ایک لمحے کے لئے خود بھی سمجھ نہ آیا کہ اقراء ہے کون۔

"اشفاق صاحب کیا ہوا؟ اور یہ نام آپ نے کہاں سن لیا؟"
"عمر جب میں وارڈ میں تھا تو علی کو ہوش آیا تھا اور وہ بار بار اقراء کا نام لے رہا تھا۔"
"اب آپ سے کیا چھپانا میں بتا دیتا ہوں" عمر نے تمام تفصیل اشفاق صاحب کو بتا دی.
"خالو اب اسکا کیا بنے گا میں دن رات یہی سوچتا ہوں مجھے اس کی پریشانی کھائے جاتی ہے۔"
"عمر تمہارے مطابق اسکے مقدر میں اب وہ لڑکی نہیں رہی جسے وہ چاہتا ہے"
"جی"
اور یہ بھی سچ ہے کہ اسکا دل اب کسی اور سے نہیں لگتا بلکہ یہ لگانا ہی نہیں چاہتا"
"جی۔۔۔۔ میں کیا کروں میں اسکے ساتھ وقت گزارتا ہوں مگر اب تو یہ بھی میری شکل دیکھ دیکھ کر اُکتا چکا ہے۔۔۔۔۔ مگر میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔" عمر بیچارگی سے بولا اشفاق صاحب نے کچھ سوچنے کی غرض سے کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر سر کو پیچھے کی طرف ٹکا دیا اور سوچنا شروع کیا.
لمبی سانس لینے کے بعد اشفاق صاحب نے عمر کی طرف دیکھا اور کہا کہ
"عمر بیٹا دیکھو... عشق اگر انسان سے ہو جائے تو تکلیف بھی دیتا ہے سکون بھی لیکن ایک ذات ایسی ہے جس سے عشق کرنے کے بعد سکون ہی سکون ہے تکلیف نہیں ملتی۔"
"میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" عمر ناسمجھی سے بولا
"دیکھو بیٹا علی کو اس انسان سے محبت ہے جو اسے مل نہیں سکا اور اب شاید کبھی مل بھی نہ سکے میرا مشورہ ہے اسے اس سے محبت کرنا سکھاؤ جو اسے مل جائے گا۔..
"میں سمجھ گیا کیا خوب بات کہی آپ نے
کیونکہ نہ اس کا دل کسی انسان سے لگتا ہے نہ کسی شے سے "اسے عشق پیدا کرنے والے سے عشق کرنا ہوگا۔" مگر یہ سب ہوگا کیسے؟... عمر سر کھجاتے ہوئے بولا
"بیٹا ایک بابا جی ہیں ان کے پاس جاؤ وہ تمہیں تمہارا مقصدِ حیات بتائیں گے"

"جی بہتر مجھے انکا نمبر دے دیں یا کوئی لنک؟"

اشفاق صاحب نے قہقہہ لگایا"....ہاہاہاہانہیں عمر یہ کوئی فیس بک والے بابا جی نہیں ہیں انکے پاس جانے کے لئے محنت درکار ہے".

" کیسی محنت؟"

بیٹا اسے قرآن پڑھاؤ اور خود بھی پڑھو اسے مذہب سے جوڑو. اسے وہ بتاؤ جس سے انسان اللہ کے قریب ہو جاتا ہے .بیٹا وہی ایک ذات ایسی ہے جو بے نیاز ہے.

پھر اسکے بعد میں تمہیں خود بابا جی کہ پاس لے جاؤں گا"

\-

"صاحب میں اندر آ جاؤں؟" یہ اسلم کی آواز تھی

"جی اسلم آؤ علی کا بتاؤ کیسا ہے اب؟"

"جی صاحب کو ہوش آ گیا ڈاکٹر صاحب نے یہ پرچی دی ہے"

" ٹھیک ہے یہ مجھے دو اور تم وہی رہو میں ابھی آتا ہوں"

"جی ٹھیک ہے صاحب جی"

اسلم دروازہ بند کر کے چلا گیا

"دکھاؤ عمر یہ پرچی ادھر دو"

اشفاق صاحب نے اس پرچی کو دیکھا اور سائیڈ پر رکھ دی

" آؤ اسکو ملنے چلیں"

اشفاق صاحب اور عمر،علی کو ملنے چلے گئے

"علی میرے بھائی اب کیسے ہو؟ دیکھو تو ذرا کتنا خوبصورت انسان لیٹا ہوا ہے" عمر اسکے چہرے پر ہنسی لانا چاہتا تھا

علی نے عمر کی طرف ہاتھ بڑھایا عمر نے اسکا ہاتھ تھام لیا

اشفاق صاحب نے علی کی فائل کا جائزہ لیا اور کہا "بیٹا بہت جلد تم گھر چلے جاؤ گے۔عمر تم ذرا میری ایک منٹ بات سنو میں نے گھر بھی جانا ہے"

"جی انکل میں آیا" عمر نے اُٹھ کر علی کے ماتھے پر بوسہ دیا اور کہا میں ابھی آیا

"عمر اسکا جتنا خیال رکھ سکتے ہو رکھو"

"پریشانی کی بات ہے؟" عمر تشویش سے بولا

"نہیں عمر بس اس کی رپورٹس اتنی بھی نارمل نہیں ہیں اسے دماغی آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ کل تم اسے گھر لے کر جا سکتے ہو زخم کل تک بہت بہتر ہو جائے گا اور اس بچی کو میں فلحال بچہ وارڈ میں بجھوا دیتا ہوں اسکی فکر نہ کرو اسکا بعد میں سوچیں گے ابھی علی کا خیال رکھو۔" اشفاق صاحب نے کہا.

"جی بہتر انکل جی آپکا احسان مند ہوں" عمر نے ممنوئیت سے کہا

" کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹے ہو تم میرے،سلامت رہو"

اتنا کہہ کر اشفاق صاحب چلے گئے.

عمر علی کے پاس گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا

عمر ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا تا کہ اسکا ذہن اقراء کی طرف نہ جائے مگر علی بار بار اسکا ذکر شروع کر دیتا

"عمر اسکو خبر دو میں بیمار ہوں صرف ایک بار بتا دو وہ جہاں بھی ہو گی آ جائے گی" علی بضد تھا

"علی میرے بھائی وہ نہیں آ سکتی تو جانتا ہے کہ اب اس کی شادی ہو چکی ہے"

"نہیں تم نہیں جانتے یہ دو طرفہ عشق ہے اسکی ڈوری کوئی نہیں کاٹ سکتا میں معاذ کے آگے ہاتھ جوڑ لوں گا اسکے پاؤں پڑ جاؤں گا کہ مجھے میری اقراء واپس دے دے۔"

"نہیں علی وہ ایسا نہیں ہونے دے گا . تقدیر پر فیصلوں پر انسان کو سوال کا اختیار نہیں ہوتا . اب تم خود کو سمبھالو اور اس معصوم کو بھی دعا دو کہ اب وہ جہاں رہے عزت و احترام کے ساتھ رہے.

محبت کی ہے تو اس کے تقاضے بھی پورے کرو ۔اب وہ اپنا آشیانہ شروع کر چکی ہے ۔اس کو اب واپس پانے کی بات کرنا غلط ہے اور یہ بات محبت سے خودغرضی کی جانب انسان کو لے جاتی ہے. مجھے معلوم ہے تمہارا عشق بے لوث تھا.

تم فلحال خاموش رہو اور آرام کرو بالکل کچھ بھی نہیں سوچنا ورنہ میں یہاں کسی بھی نرس سے شادی کروا دونگا

وہ دیکھ وہ والی آنٹی تیرے لئے ٹھیک رہے گی"

علی مسکرایا... عمر کی مذاق کی عادت تھی اور وہ علی کے لئے فائدہ مند ثابت ہوئی۔

علی کو جب گھر لے جایا گیا تو عمر ہی تھا جس نے اسے اپنی باتوں میں لگائے رکھا اور کتاب لے کر پاس بیٹھ جایا کرتا تھا۔

وہ ذیادہ تر مذہب کی کتابیں پڑھتا تھا تا کہ علی یہ سب جان سکے اور سمجھ سکے۔ہم بطور انسان تخلیق کیوں کیے گئے تھے ۔اللہ کی ذات انسان سے کیا چاہتی ہے ۔انسان کی حقیقی فلاح کا راستہ کیا ہے ۔واجبی سا دینی علم رکھنے والے علی کے دل کے اندر ایک ایک بات گھر کرتی چلی جا رہی تھی. اس کا وجود اندر سے دوبارہ جڑ رہا تھا مگر اس بار اس کی جگہ کہیں اور تھی.

عمر اور علی دونوں ہی پڑھے لکھے تھے اسی لئے انہیں کچھ بھی سمجھنے کے لئے ذیادہ تگ و دو نہ کرنا پڑتی تھی اور تو اور علی اب پہلے سے بہت بہتر ہو چکا تھا مگر اقراء کا تذکرہ وقفے وقفے سے کرتا رہتا تھا مگر عمر اسکی رگ رگ سے واقف ہو چکا تھا.

ایک روز اشفاق صاحب کا فون آیا علی کے بارے میں پوچھتے رہے علی بھی پاس ہی موجود تھا اشفاق صاحب نے اس سے بچی کے بارے میں پوچھا کہ کیا کرنا ہے ہم ذیادہ دیر ہسپتال میں نہ رکھ پائینگے۔

"اشفاق صاحب بچی کے بارے میں تو میں نے کچھ نہیں سوچا چلیں میں ابھی کچھ سوچ کر بتاتا ہوں"

علی فوراً بولا "بچی کون سی بچی؟"

"علی جب تم بیمار تھے تو مجھے واپسی پر ایک بیگ ملا تھا جس میں ایک بچی موجود تھی میں اسے ساتھ ہی لے گیا تھا۔"

" کہاں ہے وہ بچی مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تم بھی شہزادے ہو عمر"

"لو بھئی تم نے کیا کر لینا تھا"

"میں اسے پالوں گا اسے اپنا لوں گا۔"

عمر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا"... یہ تم کیا کہہ رہے ہو علی"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں میں اسکا نام اقراء رکھوں گا"

"اُف میرے خدایا"

"عمر تم چپ رہو اور اشفاق صاحب کو کال کرو مجھے وہ بچی ابھی اپنانی ہے"

"اچھا بابا یہ لو"

"ہیلو انکل کیسے ہیں آپ انکل جی میں تو نہ کچھ سوچ پایا مگر شہزادے علی نے کچھ سوچا ہے اس نے تو بچی کا سنتے ہی رٹ لگا لی ہے کہ وہ بچی یہ اپنائے گا اور اس کی دیکھ بھال کرے گا" عمر ساری بات بتائی

"علی نے ایسا کہا ہے؟"

"جی انکل"

"بیٹا کیا تم نے میری باتوں پر عمل کیا تھا جو میں نے تم سے کہی تھیں؟"

"جی انکل میں نے اتنا عمل کیا کہ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی سمجھ دار ہو گیا ہوں کونسی کتاب ہے جو میں نے اسے پڑھ کر نہ سنائی ہو"

"شاباش ایک عظیم اجر تمہارا منتظر ہے سلامت رہو۔

ٹھیک ہے یہ بچی اسکو دے دو اور میں نے فیصلہ بھی کر لیا ہے کہ میں تم دونوں کو کل ہی بابا جی کے

پاس لے کر جاؤں گا۔"

"ارے واہ آخر وہ گھڑی آ گئی جس کا ہمیں انتظار تھا"

"جی عمر بیٹا آج میں بچی بھجوادونگا اسکے کا غذات وغیرہ دیکھ لینا"

"جی بہتر بہت شکریہ" عمر نے فون بند کیا اور علی سے بولا" . لے بھئی خدا نے تجھے رحمت عطا کر دی"

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے عمر مجھے معلوم ہے یہ پھل مجھے اللہ اور اسکے رسولﷺ سے محبت کی وجہ سے ملا ہے۔ جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔"

عمر کی آنکھوں میں آنسو تھے "میرے بھائی تو نے میرا دل جیتا ہے آج۔"

اپنے آنسوؤں کو صاف کر کے علی کو گلے لگایا اور کتاب لے کر اسکے پاس بیٹھ گیا

تھوڑی ہی دیر میں اشفاق صاحب کا ڈرائیور بچی کو لے آیا ساتھ ہی انکی کال بھی آ گئی انہوں نے کہا کسی بھروسہ مند خاتون کو ڈھونڈو جو اسکی دیکھ بھال کرے تم لوگوں سے یہ نہ ہو پائے گا.

"جی انکل ضرور بلکہ ہم یہی سوچ رہے تھے کہ ہم اسکی دیکھ بھال کے لئے کسی کو کام پر رکھیں گے"

"او کے ٹھیک ہے کل صبح تم دونوں میری طرف آ جانا بابا جی کے پاس جانا ہے"

"جی بہتر بہت شکریہ۔"

"علی اٹھو بابا جی کے پاس جانا ہے۔"

علی ساری رات ٹھیک سے سو نہ سکا تھا وہ بچی کے ساتھ وقت بِتا تا رہا جب کبھی ذرا سی آنکھ لگ جاتی تو بچی کے شور سے اُٹھ جاتا.

"عمر تھوڑا اور سونے دو" علی خمار آلود آواز میں بولا

"نہیں بھائی اُٹھو اشفاق صاحب وقت کے پابند ہیں ہمارا انتظار کر رہے ہونگے" عمر نے

کیا"... یہ بچی باؤ جی کے حوالے کرو آج ہی اسکا بندوبست بھی کریں گے گڑیا کے لئے نئے کپڑے بھی لائیں گے۔"

" گڑیا کا نام بھی ہے اقراء نام ہے اسکا" علی چلایا

"اچھا بابا اچھا غصہ نہ کرو اُٹھو۔"

علی اور عمر اشفاق صاحب کے گھر پہنچے تو پہلے سے انہیں اپنا منتظر پایا

"چلو بچو چلیں ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے تم لوگ وقت کی پابندی کیوں نہیں کرتے"

اشفاق صاحب کی پیاری سی ڈانٹ انہیں اچھی لگی

اشفاق صاحب نے انہیں گاڑی میں بیٹھ کر بابا جی کے بارے میں سب بتایا انہوں نے بتایا کہ میں تمہاری خالہ کے جانے کے بعد ان بابا جی سے ملا تھا میرے دل میں اللہ سے بہت گلے شکوے بھر چکے تھے مجھ سے میری شریکِ حیات چھین لی تھی۔مگر جب میں ان سے ملا مجھے معلوم ہوا کہ اصل میں زندگی کیا ہے۔

اشفاق صاحب باتیں کرتے رہے اور گاڑی ایسے رستے پر مڑ چکی تھی جہاں آبادی بہت کم تھی۔

ایک سادہ سے گھر کے باہر جا کر گاڑی کی بریک لگی

تینوں اُتر کر کھڑے ہو گئے , دروازہ کھٹکھٹایا

اندر سے ایک سفید داڑھی والے بابا جی آئے

آنکھیں انکی موتی سی معلوم ہوتی تھیں اور چہرے پر مانو نور تھا ہاں وہ نور ہی تھا

"اشفاق بیٹا تم آئے ہو آ جاؤ اندر آ جاؤ... یہ دونو جوان کون ہیں؟"

تینوں اندر چلے گئے

"بابا جی یہ والا عمر ہے میرا رشتے دار ہے میرے بیٹوں جیسا ہے اور یہ لڑکا علی ہے یہ عمر کا دوست ہے" اشفاق صاحب نے واضح کیا.

"اچھا تم دونوں اس طرف بیٹھ جاؤ اور علی کو میرے پاس بیٹھنے دو۔" بابا جی نے فرمایا

علی اور عمر دونوں حیران تھے کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا۔جبکہ اشفاق صاحب نے مسکراتے ہوئے بابا جی کہ ہاتھ چومے اور حکم کے مطابق بیٹھ گئے

عمر کا ماتھا ٹھنکا اس نے فوراً یہی اندازہ لگایا کہ یہ بابا جی تو واقعی پہنچے ہوئے ہیں دیکھتے ہی مریض پہچان گئے حالانکہ علی کے ماتھے پر مریض لکھا بھی نہیں ہوا۔

عمر کے ایسا سوچنے پر بابا جی نے اسکی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا

عمر ایک پل کے لئے ششدر رہ گیا"...یہ ہو کیا رہا ہے۔"

بابا جی نے علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا"... علی کچھ سناؤ کبھی کچھ گنگنایا ہو"

عمر مذید پریشان ہوا اٹھا کیونکہ علی بہت پہلے گانے گایا کرتا تھا مگر یہ یہاں گانے سنائے گا؟ یا خدا یہ لڑکا اب کیا کرے گا کہیں اس نے گانا شروع کر دیا تو کیا ہوگا اشفاق صاحب کی عزت کی کیا رہے گی

اشفاق صاحب اطمینان سے بیٹھے سب دیکھتے رہے۔

"جی بابا جی میں اللہ کے حبیب حضرت محمدﷺ کی شان بیان کر کے سناتا ہوں ایسا کرنا تو میرے بس میں نہیں مگر میں کوشش کرتا ہوں۔..."ایسا کرتے ہی علی نے نعت خوانی شروع کر دی عمر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے یہ سب کب سیکھا تھا یہ تو بس گانے گاتا تھا۔

نعت سُن کر بابا جی نے علی کے کندھے کو تھپتھپایا.. عمر یہ سب دیکھ کر عجیب کیفیت میں تھا .اس نے دیکھا کہ علی کی آنکھوں میں آنسو تھے.

بابا جی نے علی کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے پوچھا "بیٹا اگر کبھی تمہیں تمہارے خواب میں آپﷺ کا دیدار ہو جائے تو تم انکے در پر حاضری کے منظر کے لیے کیا عرض کرو گے؟"

علی نے کہا"... بابا جی میں آپ کے اس سوال پر صدقے جاؤں قربان جاؤں میں نظریں جھکا کر ہاتھ باندھ کر بڑے ہی ادب سے آواز کو دھیمے رکھتے ہوئے عرض کروں گا یا رسولﷺ میری بس اتنی سی خواہش ہے کہ جب بھی میں مدینہ پاک آؤں میں آپ سے عشق کی انتہا کے لئے دنیا

سے نا آشنا ہو کر گم ہو جاؤں اور وہاں بارش ہو رہی ہوتا کہ میرے اندر عشق کی تپش باہر کی بارش سے مل جائے اور میرے آنسوؤں کو چھپنے کا ٹھکانہ مل سکے . میرا عشق صرف آپ کے لیے ہے تو کوئی اور کیونکر میری بے قراری کو دیکھے .

اور وہ کیا خوب شعر ہے نا کہ

کیسے انکی چوکھٹ پر خود پہ قابو پاؤنگا

ذکرِ مصطفیٰ ﷺ سے ہی چشمِ تر نکلتے ہیں"

عمر یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا اس نے سوچا کہ کتابیں تو دونوں نے پڑھی تھیں پھر اس پر زیادہ اثر کیسے ہو گیا" واہ میرے شیر واہ"

یہ الفاظ عمر کے منہ سے یکدم نکلے۔

بابا جی ،علی اور اشفاق صاحب نے عمر کی طرف دیکھا عمر شرمندہ ہو گیا

"معذرت چاہتا ہوں روک نہ پایا خود کو"

بابا جی مسکرائے اور بولے "تمہارے دل کی کیفیت سمجھ سکتا ہوں اللہ تم دونوں کی دوستی سلامت رکھے۔"

"آمین" دونوں نے یک زبان ہو کر بولا تھا

"علی بیٹا میری تمنا ہے کہ تم اللہ کے دوست بن جاؤ

تمہاری کُل کائنات وہی ہے تمہارے عشق کی نہ بجھنے والی پیاس کبھی دنیاوی محبت سے تر نہ ہو پائے گی

اللہ سے لو لگا لو وہ صاف دل والے پیاسے کو پاس بلاتا ہے اور اپنے قریب کرتا ہے وہ تمہیں سکون دے گا وہ اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے بیٹا عشق ایک آگ ہے جو محبوب کے سوا سب جلا دیتی ہے تمہارا راستہ عشق مجازی سے شروع تو ہوا ہے مگر تمہیں عشقِ حقیقی کی طرف جانا ہے جب کوئی انسان عشق میں مبتلا ہو جائے تو اسکا مقصود صرف معشوق ہوتا ہے۔اور معشوق کے علاوہ ساری

خواہشات اسکے اندر سے آہستہ آہستہ ختم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ نہ روزگار کی فکر، نہ کھانے پینے کا ہوش نہ اپنے فرائض کا احساس اور نہ اپنے حقوق کا احساس۔ یعنی معشوق کو پانے کی شدید خواہش انسان کو ہر چیز سے بے پروا اور غافل کر دیتی ہے۔ انسان کی صحت بھی گرنے لگتی ہے۔ عاشق سوکھ کر کانٹا ہو جائے، اس کی رنگت پیلی ہو جائے تو یہ ایک معمول کی بات ہے۔... روحانی ترقی کیا ہے جانتے ہو کیا ہوتی ہے؟ بابا جی نے نرمی سے علی کو تفصیلاً سمجھا کر سوال کیا

"نہیں بابا جی" علی بولا

"روحانی ترقی کے لئے نفسانی خواہشات کو دبانا اور ترک کرنا پڑتا ہے۔ کھانے کی خواہش کم سے کم کی جائے۔ نا کسی کی غیبت، نا چغلی نا فالتو بات، نا بے حیائی کے کام الغرض ساری نفسانی اور دنیاوی خواہشات سے نجات حاصل کی جائے۔

جب ایک عاشق صادق عشق میں کافی عرصے تک مبتلا رہے اور آہستہ آہستہ تمام نفسانی اور دنیاوی خواہشات سے نجات حاصل کر لے تو اسکی روح بہت طاقت ور ہو جائے گی اور قرب الٰہی کا مزا چکھنے لگے گی۔ اور ایک وقت آئے گا جب عاشق صادق قرب الٰہی کی لذت معشوق مجازی کے شوق سے بہت زیادہ پانے لگے گا تو معشوق مجازی اسکا مقصود نہیں رہے گا اور عشق حقیقی اسکی منزل پالے گا۔

تم میری ان باتوں کو گھر جا کر لازمی دہرانا، سمجھنا
ان پر عمل کرنا ہوگا۔"

"جی بابا جی میں سمجھ گیا ان شاءاللہ میں ضرور عمل کرونگا..." علی کی آواز بھاری تھی جیسے وہ ابھی بھی رو رہا ہو۔

"تم لوگوں کو اجازت ہے جا سکتے ہو..." بابا جی جائے نماز پر بیٹھ گئے اور وہ سب سلام کر کے چلے آئے.

"علی یہ سب کیا ہوا میں تو حیرت میں مبتلا ہوں"

عمر نے گاڑی میں بیٹھتے ہی پوچھا

"عمر میں خود انکی باتوں میں کھو چکا ہوں تمہیں کیا بتاؤں"

علی گھر گیا بچی کو پیار کیا اسکے ساتھ وقت گزارتا مختلف کتابیں پڑھتا یوں وقت گزرتا رہا اس نے کہیں پڑھا تھا کہ "اللہ کے ساتھ کاروبار کرو"

اس نے ایسا ہی کیا ہوا تھا بزنس کا بہت سا حصہ خیراتی اداروں کو خیرات دیتا تھا رزق میں کبھی کمی نہ آئی تھی۔

باؤ جی علی کو ایسا کرتے دیکھ بہت خوش ہوتے تھے۔

اور عمر تو مانو اپنا گھر بھول ہی گیا تھا کبھی کبھی اپنے گھر جایا کرتا تھا اسکے گھر والے سب جانتے تھے علی اور عمر دن رات اللہ کے بندوں کی مدد میں لگے رہتے یہاں تک کہ دونوں کا کاروباری منافع اتنا ہو چکا تھا کہ ایک مدرسہ بنا سکتے تھے.

پہلے باؤ جی اور پھر بابا جی سے اجازت لے کر انہوں نے یہ کام شروع کر دیا

رات دن ایک کر چکے تھے۔

بچی جو کہ اب بڑی ہو رہی تھی وہ سکول بھی جانے لگی اسکی دیکھ بھال میں بھی کوئی کمی نہ آئی

وہ علی کو بابا کہتی تھی۔

اور علی اسے میری اقراء بٹیا کہا کرتا تھا۔

علی اور عمر اللہ کے کاموں میں اتنا مشغول ہو چکے تھے کہ دنیاوی خواہشات کی طلب نہ رہی۔

وہ صرف اتنا چاہتے تھے کہ ایک ایسا شاندار مدرسہ بنے جس میں ہزاروں بچے اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا نام لے سکیں۔

ایک روز علی اور عمر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"عمر ہم کیا تھے اور کیا بن گئے ہیں نا؟"

علی اور عمر ایک دوسرے کی طاقت تھے ان کی دوستی مثالی تھی.

"میں جب تمہیں پاس پاتا ہوں تو خود کو مکمل محسوس کرتا ہوں۔تم نہ ہوتے تو میں گمراہ ہو چکا ہوتا۔تمہارے توسط سے ہی میں بابا جی سے مل پایا

اور یہ سب دیکھو کہ اب میں دنیا کا کتنا خوش نصیب انسان ہوں۔عمر اللہ تم سے راضی ہو"

" آمین میرے بھائی دیکھو اللہ پاک نے دوستی دلوں میں ڈالی ہی اس لئے تھی کہ ہم اسکے بتائے ہوئے راہ پر چل سکیں۔یہ بے تکی خواہشات بلاوجہ کی ضرورتیں کتنی بے رنگ سی ہیں نا؟ اصل رنگ تو اللہ کی قُربت میں ہیں۔" عمر نے کہا

" بے شک عمر اللہ ہم سے ضرور خوش ہوگا اور یہ مدرسہ کسی امدادی فنڈز سے نہیں چلے گا بلکہ یہ ہم خود چلائیں گے اللہ ہمیں اتنا دے گا کہ کمی نہ آپائے گی۔

بھئی میں نے تو سوچ رکھا ہے کہ اس مدرسے کی تعمیر مکمل ہوتے ہی پہلی فجر کی آذان میں ہی دونگا وہ کیا دن ہوگا۔" علی نے کہا

" سبحان اللہ علی اللہ تم سے راضی ہو ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا" عمر کو دلی خوشی ہوئی

" اچھا تم ایسا کرو اقراء کے سکول کے کام ایک نظر دیکھو . میں ذرا نماز ادا کر لوں" اتنا کہہ کر علی کمرے میں چلا گیا اور نماز کے لئے وضو بنانے لگا.

ادھر عمر اقراء سے باتیں کرنے لگا اسے سکول کے کام میں مدد کرنے لگا . ننھی معصوم گڑیا اب دونوں کے جینے کی وجہ بن گئی تھی.

علی جائے نماز سیدھا کر رہا تھا اور پیار سے مسکراتے ہوئے اقراء کو دیکھ رہا تھا۔عمر یہ منظر دیکھ کر خوش ہو رہا تھا عمر کو یاد آیا کہ علی کو باؤ جی کا پیغام دے گا کہ اب اسے بھی شادی کر لینی چاہئے۔مگر اسکے دل میں بے چینی سی آ گئی وہ الجھنوں کا شکار ہو گیا . وہ اس بے چینی کو کوئی نام دینے سے قاصر تھا.

وہ اقراء کو یہ کہہ کر پانی پینے چلا گیا کہ بیٹا آپ کام کرو میں ابھی آیا۔

عمر جب پانی پی کر کمرے میں آیا تو بیٹھ کر علی کو دیکھتا رہا. علی سجدے میں تھا عمر علی کو اس وقت تک دیکھنا چاہتا تھا کہ جب تک وہ سجدے سے اُٹھ نہ جاتا مگر جب سجدہ طویل ہو گیا تو عمر نے علی کو آواز دی مگر وہ نہ ہلا جب پاس جا کر ہلایا تو بے جان جسم کی طرح دوسری طرف گر گیا

"علی علی کیا ہوا ہے اُٹھو" عمر تڑپ اٹھا

علی نہ بول سکا وہ خاموش ہو گیا تھا وہ مصروف تھا اپنے محبوب سے باتیں کرنے میں. یوں نظریں چرالینا سانسیں روک لینا یہ ثابت کر چکا تھا کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا ہے۔وہ ایسی وفات پا چکا تھا جس کی خواہش ہر مسلمان کرتا ہے۔وہ سجدے میں تھا اللہ سے باتیں کرتے ہوئے ہی اللہ کے پاس جا چکا تھا مرنے سے پہلے اسکا دل صاف ہو چکا تھا دنیاوی خواہشات مر چکی تھیں۔وہ اللہ کا دوست بن چکا تھا۔

انکی دوستی کا رشتہ سفرِ عشق اختیار کر چکا تھا۔

گھر میں سوگ منانے والے لوگ بہت زیادہ نہ تھے مگر جب یہ خبر پھیلی تو ہزاروں کی تعداد میں لوگ جنازہ میں شریک ہوئے۔

علی مرنے سے پہلے لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا تھا ایسا گھر بنا کر گیا تھا جو کبھی ڈھایا نہیں جا سکے گا۔

عمر نے مدرسے کے کام کو جاری رکھا اور ایک دن وہ بھی پایہ تکمیل کو پہنچا جب مدرسے کا افتتاح ہوا تو عمر نے علی کی معصوم خواہش خود پوری کی اس نے فجر کی آذان دی جب وہ اذان دے رہا تھا تو علی کو اپنے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔اسکی خوشبو خود میں محسوس کر رہا تھا۔

ہزاروں بچے اس مدرسے سے استفادہ کر رہے تھے

علی اور عمر کا جو بزنس تھا وہ بند نہ ہوا اس سے ملنے والے منافع سے عمر نے اور بھی مدرسے اور بے گھروں کے لئے گھر بنوانے کی ٹھانی۔

علی کی محبت دنیا میں بھی سچی تھی وہ نکاح جیسے مقدس رشتہ میں بندھ جانا چاہتا تھا مگر دنیا کے عجیب

وغریب رواج اس کے معصوم دل کو نا سمجھ سکے اور اسکو توڑ کر رکھ دیا تب اس کو وہ ملا جس کی تمنا ہر کوئی کرتا ہے مگر یہ نصیب کی بارش ہے جو کسی کسی پر برستی ہے اس کی بے لوث محبت پاکیزہ جذبات اسکو انسانوں سے اٹھا کر اللہ کی محبت کی جانب لے گئے تھے۔ یہ اس ذات کی محبت تھی جہاں کبھی کسی کا دل نہیں ٹوٹتا . وہاں بس مرادیں بر آتی ہیں . اس کو اللہ کی محبت کو ایسا دل میں بسایا کہ اس کے قلب سے دنیا نکل گئی۔ اس کو ایسا محبوب مل گیا جو ابدی ہے . اس نے روگ ختم کر کے ایسی اڑان بھر لی جس پر زمانہ رشک کرتا ہے۔ وہ سچے اور صاف دل کا انسان اس پر فریب انسانوں کی بستی سے اپنے مالک کے حضور چلا گیا جہاں اعمال اچھے ہوں تو انسان دکھوں سے ماورا ہو جاتا ہے۔ اور شاید علی وہ چیز پا گیا تھا جس کی تمنا اس کے دل کے اندر چھپی ہوئی تھی.

عمر راہ دیکھتا رہا اور اس کا دوست اس کا بھائی منزل پا گیا۔

اقرا جب بھی پوچھتی کہ بابا کہاں ہیں تو

عمر اسے پیار سے صرف اتنا کہتا تھا

" کہ اللہ کے پاس کسی کام سے گئے ہیں۔"

☆☆☆

(سولفظی کہانیاں)

1۔ ویزا

فارغ وقت میں سب اکٹھے بیٹھے تھے۔

ایک نے کہا میں امریکہ سے آیا ہوں۔

کیا کرنے گئے تھے؟

میں پڑھائی مکمل کرنے گیا تھا۔

اچھا مکمل ہوگئی؟

میں نے پوچھا

جی ہاں ہوگئی۔

وہاں پڑھائی مکمل کرنا ممکن ہے؟

جی ہاں بلکل

کیوں پاکستان میں مکمل ہونا ناممکن تھی؟

اپنے ملک سے محبت کرنی چاہیے

اوراسی پر مرمٹنا چاہیے

میرے جذبات بول رہے تھے۔

آپ نے میری آنکھیں کھول دیں

اپنے ملک سے محبت کرنی چاہیے

معاذ نے کہا

بتائیے کیا انعام پیش کروں؟

امریکہ کا ویزا لگوادو۔

2۔ ٹائم مشین

میں ماضی میں گیا تھا

میں نے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے عمیر کو بتایا

ماضی میں کوئی کیسے جا سکتا ہے؟

عمیر حیران تھا۔

میرے انکل نے مشین ایجاد کی ہے۔

مشین کیسی مشین؟

عمیر نے پوچھا

ماضی میں جانے کی مشین

واہ! کیا تم مجھے یہ مشین دکھاؤ گے؟

جو ماضی میں لے جاتی ہے؟

میں نے ہاں میں جواب دیا

کیا وہ مشین ہمیں مستقبل میں لے جائے گی؟

عمیر نے پوچھا

ہاں عمیر لے جائے گی مگر تم مستقبل میں جا کر

کیا دیکھنا چاہتے ہو؟

عمیر کا جواب تھا ''مستقبل کا وزیرِ اعظم''

3۔ وہ تم ہو

1965 کی جنگ چل رہی تھی

یہ اتنے لوگوں کا مجمع کیوں لگا ہے؟

اوران کے سامنے یہ کیا پڑا ہے؟

یہ لوگ اسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟

سعد نے دادا جان سے پوچھا۔۔

سعد ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے

بہت گہری نیند سے بیدار ہوا ہو

اور بہت تازہ محسوس کر رہا تھا۔

اور سعد نے دوسرا سوال بھی پوچھ ڈالا

کہ دادا جان اور جنت کیسی ہے؟

دادا جان نے جواب دیا کہ جنت بہت اچھی ہے

تم دیکھنا چاہو گے؟

سعد نے کہا کیا مطلب؟

اب دادا جان نے سعد کے پہلے سوال کا جواب دیا تھا

کہ بیٹا وہ جسے دیکھ رہے ہیں ''وہ تم ہو''

4۔ مذاق

تم دبئی جا رہے ہو؟

تمہیں کس نے کہا؟

حمزہ اپنا حلق تر کرتے ہوئے بولا

پرسوں دوستوں میں یہی تو بات ہوئی تھی۔

وہ میں نے مذاق کیا تھا

مذاق تھا؟

اچھا تو اس دن جو بھی باتیں ہوئیں وہ مذاق تھیں؟
میرے لہجے میں طنز تھا
تم نے بتایا تھا تم پاس ہو گئے ہو
تمہیں سکالرشپ بھی ملی
تمہیں انعام بھی ملا
پر افسوس وہ تو مذاق ہو گا
حمزہ بولنے ہی لگتا مگر میں موقع نہ دیتا
اور میرے یہ الفاظ حمزہ کو شرمندہ کر گئے
''بیٹر لک نیکسٹ ٹائم'' (اور اب حمزہ مذاق نہیں کرتا)

5۔ بے قصور

ایسا کب تک چلے گا؟
میں نے خود سے سوال کیا
روز ایسا ہی ہوتا ہے
صبح سے شام تک شور مچاتے ہیں۔
پھر سب کچھ بھول جاتے ہیں
میں پریشان تھا
ثاقب نے پوچھا کیا ہوا
مجھے دو الفاظ مل گئے ہیں
میں نے جواب دیا
کون سے دو الفاظ؟

دو الفاظ اللہ پر چھوڑ دیے ہیں

بے شک اللہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے

میں بے قصور زینب کی بات کر رہا ہوں

میں نے ثاقب کے تجسس کو کم کیا

اور وہ دو الفاظ کون سے ہیں

میں نے جواب دیا کہ

انصاف اور سزا۔۔

6۔ ڈیم

مال روڈ پر احتجاج ہو رہا تھا

یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟

پرسوں بھی یہ لوگ یہیں موجود تھے

کیا انہیں انصاف نہیں ملا؟

مبشر نے مجھ سے پوچھا

یہ لوگ دودھ فروش ہیں

اور ہمارے لیے حق مانگ رہے ہیں

میں نے موٹر سائیکل کو آہستہ کرتے ہوئے جواب دیا

دودھ فروش اور حق ہمارے لیے؟

یہ سب ڈیم بناؤ مہم چلا رہے ہیں

مبشر سوچ میں پڑھ گیا

کہ صرف دودھ فروش ہی کیوں؟

آخر مبشر کی بے چینی ختم کرتے ہوئے بولا
پانی کی قلت کے باعث انہیں خالص دودھ بیچنا پڑے گا۔

7۔ مستقبل

ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم
اچھے دور میں پیدا ہوئے ہیں
میں نے مقصود کو کہا
آپ اس دورِ حاضر کو اچھا کیسے کہہ سکتے ہیں؟
نجومی صاحب
مقصود نے مجھ سے حیرت انگیز طریقے سے پوچھا
مقصود یہ دور بہت اچھا ہے
ماضی، حال، مستقبل کے بارے میں بتائیں
مقصود نے پوچھا
ماضی میں جہالت تھی مگر تب بھی لوگ خوشحال تھے
اور آج لوگ خوشحال بھی ہیں
اور جہالت بھی عام ہے
اور مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے؟
مقصود نے پھر پوچھا
مستقبل میں خوشحالی تو ہوگی
مگر انسانیت نہ ہونے کے برابر

8۔ شیطان

فجر کی نماز کے بعد
اچانک فون کی گھنٹی بجی
قرض داروں کے نام ذہن میں گھومنے لگے
جی کون؟
میاں صاحب جاگ رہے ہیں؟
یہ عاصم کی آواز تھی
نہیں سو رہا ہوں کہتے ہو تو اُٹھ جاتا ہوں
آپ تو غصہ ہی کر جاتے
ایک بات پریشان کر رہی تھی
اگر اجازت ہو تو پوچھ لوں؟
میں نے بھی ماڈرن ہو کر ایچ ایم ایم کر دیا
جی شیطان کو دیکھنا چاہتا ہوں عاصم کی بات عجیب تھی
مگر اتنا بول کر میں دوبارہ مصروف ہو گیا کہ
یہ جو ہاتھ میں پکڑا ہے
یہ شیطان کے والد صاحب ہیں۔

9۔ مصروف

سب سے زیادہ مصروف کون لوگ ہوتے ہیں؟
میں نے راشد سے پوچھا
جی سیاسی لوگ
میں نے نفی میں سر ہلا دیا

سب سے زیادہ مصروف پھر محنتی لوگ ہوتے ہیں
میں نے سر ہلانے والا عمل دہرایا
راشد نے تنگ آ کر کہا کہ سب سے زیادہ مصروف مشینیں ہوتی ہیں
اسے یقین تھا کہ میں اب اپنا سر نفی میں نہیں ہلاؤں گا
مگر میرا سر پھر نفی میں ہلا
راشد نے پوچھا آخر اتنا مصروف کون ہے
کس کا نام لوں تو تمہارا جواب ہاں میں ہو؟
میں نے جواب میں صرف اتنا ہی کہا
''گناہ لکھنے والے فرشتے''

10۔ ناآشنا

آج پانچ ایسے لوگوں سے ملا جن سے مل کر تعجب ہوا
میں رحمان سے بات کرتے ہوئے اسکو دیکھ بھی رہا تھا
میاں تعجب کیوں؟
رحمان نے ڈرامہ سیریل کی طرح پیچھے مڑتے ہوئے کہا
دو لوگ وہ تھے جو میری روزمرہ کی مصروفیات سے واقف تھے
مگر خوش اخلاقی دکھانے میں ناکام رہے۔
اور دو جن سے تقریباً دو دن بعد ملنا ہوتا
وہ بے رُخی کے ساتھ شکوے ہزار کر گئے
آخری والا سب سے الگ تھا
وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا ہاتھ ملایا سلام کے بعد دعا دی اور گیا

وہ کون تھا رحمان نے پوچھا

''ہم ایک دوسرے سے نا آشنا تھے''

11۔ شادی کا کارڈ

تم عمر کی شادی میں گئے تھے؟

اسد مجھ سے مخاطب ہوا

میرا سر ہاں میں ہلا

وہاں کے لوگ کیسے تھے؟

مجھے لوگوں کا تو معلوم نہیں کھانا بہت عمدہ تھا۔

تم کچھ دے کر بھی آئے یا نہیں اسد کے ماتھے پر سلوٹیں تھیں

نہیں کچھ نہیں دیا۔

شادی تو عمر اور سفدر کی تھی

تم عمر کی ہی شادی پر کیوں گئے؟

کیا سفدر نے کارڈ نہیں بھیجا تھا؟

بھیجا تھا وہی دیکھ کر تو عمر کی شادی میں جانا بہتر سمجھا۔

کیا مطلب اسد بولا

''عمر کا کارڈ سفدر کے کارڈ سے مہنگا معلوم ہوتا تھا''

12۔ تخلیق

کیا عجیب بات ہے نا میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولا

حمزہ پریشان ہوا میاں کیا ہوا؟

حمزہ کل بلال سے بات ہوئی

اچھا پھر؟

مجھے کہتا میاں تم اپنی شاعری تحریریں سنبھال کر بھی

رکھتے ہو انہیں ہمارے ساتھ شیئر بھی کرتے ہو

میں نے کہا ہاں بلال میں اپنی تخلیق سے پیار کرتا ہوں

بالکل اپنی اولاد کی طرح اور دکھاتا ہوں کہ دیکھو میرے

الفاظ میری اولاد کتنی خوبصورت ہے

اچھا تو ایسی بات ہے؟

بلال بولا

چلو میاں میں بھی تمہیں کل اپنی تخلیق دکھاتا ہوں

تو پھر کیا ہوا؟

وہ کل سے اپنے بچوں کی تصویریں بھیج رہا ہے۔

13۔ قربانی

پاپا قربانی کیا ہے؟

گُنگُن نے پاپا سے سوال کیا

اپنی قیمتی چیز قربان کر دینا

احمد گُنگُن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا

اسی لیے ہم اپنے شیرو (بکرے) کو قربان کر دیں گے؟

پھر سوال آیا

جی گُنگُن بیٹا

پاپا غریب لوگ قربانی نہیں کرتے انہیں گناہ ہوگا؟

نہیں بیٹا اللہ سب جانتا ہے

ہم سب محلے والے قربانی کر رہے ہیں

تو ہم سب امیر ہوئے؟

جی بیٹا

پاپا قربانی میں خون کیوں نکلتا ہے؟

بیٹا خون بہانا ہی تو قربانی ہے۔

پاپا پھر ہم محلے والوں سے زیادہ تو وہ امیر ہوئے

وہ کون گُنگُن ؟

پاپا وہی ''کشمیر والے''

14۔ شب برات اور معافی

کل کام جلدی ختم کرنا تھے

جلد کیوں مزمل نے پوچھا

شب برات تھی نا

جاگنا تھا مجھے

اچھا کیا جو کام نپٹا لئے تم نے

مزمل نے میرے عمل کی تعریف کی

تم بتاؤ رات مسجد میں گزاری یا موبائل میں

میں نے مزمل سے پوچھا

جی دونوں میں

میری عقل کو یاد آیا کہ آپ کو میسج کیا تھا

جواب نہ ملا مجھے

مزمل مدعے پر آیا

کل موبائل بند رکھا تھا میں نے

شاید تم بھی اس وجہ میں شامل ہو

میں وہ کیسے مزمل بوکھلایا

''تم نے بھی میسج میں یقیناً معافی مانگی ہوگی۔''

15۔ وٹس ایپ

عاقب میرے کاغذات تمہارے پاس ہیں

میں وٹس ایپ کر دوں گا (عاقب جلدی میں تھا)

اور تم آج کلاس میں آؤ گے؟

نہیں میں وٹس ایپ پر ویڈیو چیٹ کرونگا

(عاقب نے میری بات کو کاٹتے ہوئے جواب دیا)

اچھا تم نے اپنا ہوم ورک کرلیا ہے؟

(اس بار میں نے عاقب پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی)

ہاں اور استاد جی کو وٹس ایپ بھی کر دیا

عاقب بہت تیز ہو تم۔

(میں نے عاقب کی تعریف کی)

کھانے میں بریانی بنوانا میں آؤں گا عاقب نے مجھے کہا

''میں نے بھی جواب دیا وٹس ایپ کر دونگا''

16۔ بسنت

پہلے بات بات پر قتل عام تھا۔
پھر پستول پر پابندی لگا دی گئی
میں عمر سے اپنی بات میں مصروف تھا
پھر لوگ کچلے جانے لگے
عمر نے ساتھ ہی پوچھا پھر کس پر پابندی لگی؟
میں نے عمر سے کہا صبر رکھو بتا تا ہوں
لوگوں کے کچلے جانے کے بعد دھرنوں پر پابندی لگ گئی
میرے جواب نے عمر کو مطمئن کیا
دماغ سڑکوں پر گرے ہوئے ملے تو
ہیلمٹ پہننا لازم کر دیا
اور اب کس پر پابندی لگنی چاہیے میاں؟
عمر نے مجھ سے پوچھا
''میں نے صرف اتنا کہا صبر کرو ابھی کچھ گلے کٹنے دو''

17۔ میٹر

میں چلتے ہوئے جا رہا تھا
کہ اچانک رُک گیا
نبیل نے پوچھا میاں کیا دیکھا؟
رنگ برنگی آوازیں سنائی دیں
نبیل نے پوچھا کیا وہ پرندوں کی آوازیں تھی
میں نے نفی میں سر ہلایا
کیا وہ کسی ساز کی آواز تھی

میرا سر پھر نفی میں ہلا
نبیل نے پوچھا کہ آخر وہ کیسی آوازیں تھیں
وہ لڑائی کی آوازیں تھی نبیل
نبیل خاموش ہوگیا
میں خاموشی توڑتے ہوئے بولا
چار بھائیوں کی آوازیں تھیں
لڑائی کی آوازیں چار بھائیوں کی تھی
یہ کیسے معلوم نبیل نے پوچھا
میں نے گھر کے باہر چار میٹر لگے دیکھے تھے

18۔ تھالی

کچھ صدیوں بعد سب کچھ مٹی تلے دب جائے گا
نئے لوگ آئینگے پتوں کے کپڑے بڑے بال ننگے پاؤں
میں عثمان کے ساتھ محو گفتگو تھا
وہ اچانک بولا وہ لوگ کریں گے کیا؟
وہ زمین کھودیں گے
میں نے عثمان کے سوال کا جواب دیا
پھر کیا ہوگا
انہیں ہمارے دور کی چیزیں ملیں گی
میں نے بتایا
تو وہ انکو دیکھ کر حیران نہیں ہونگے ؟
عثمان نے پوچھا

جی ہاں بلکہ تعجب ہوگا
انہیں ایک بڑی گھڑی ملے گی
اس میں تعجب والی کیا بات ہوئی
عثمان نے پوچھا
وہ گھڑی کو کھانے والی تھالی سمجھیں گے
اور حیران ہونگے کیونکہ اس میں چھید ہوگا
مگر وہ سمجھ جائیں گے کہ پہلے کے لوگ جس تھالی میں
کھاتے تھے اسی میں چھید کرتے تھے۔

19۔ ربورٹ

ربورٹ کیا کرتے ہیں؟
نعمان نے سوالیہ انداز میں مجھ سے پوچھا تھا
میں نے جواب دیا کہ
ربورٹ انسان کے کام کو آسان کرتے ہیں۔
کتنا آسان؟
نعمان نے پھر سوال کیا
میں نے کہا ربورٹ آپکا کوئی بھی مشکل ترین کام آسان کر سکتے ہیں
اچھا کوئی مثال دو بھائی
نعمان نے مجھ سے کہا
میں نے کہا بہت سے ایسے کام ہیں جو انسان نہیں کر سکتے مگر ربورٹ کر دیکھاتے ہیں
اب کی بار میں نے سوالوں سے تنگ آ کر جان چھڑواتے ہوئے جواب دیا

اچھا تو اسکا مطلب ہمارے حکمرانوں کو بھی ربوٹ ہی بدل سکتے ہیں؟

20۔ ٹریفک

بھائی ٹریفک اتنی جام کیوں ہے؟
ساتھ والے بھائی نے مجھ سے پوچھا
کیونکہ یہاں سے عظیم لوگوں کا گزر ہوگا
میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا
عظیم لوگ کیسے عظیم لوگ؟
جو بڑے لوگ ہوتے ہیں ان کو ہم سے ڈر ہوتا ہے
اسی لئے وہ راستے صاف کروا دیتے ہیں
بھائی صاحب کے چہرے پر معمولی سا غصہ آ گیا
میری اگلی بات نے انکا غصہ ٹھنڈا کر دیا
کہ اگر ضرورت پڑے تو
حق مانگنے والوں کو بھی صاف کروا دیتے ہیں۔

21۔ فنکار

فنکار کسے کہتے ہیں؟
میرے ذہن میں یہ سوال آیا
اور احسن سے پوچھ ڈالا
احسن نے جواب دیا
فنکار جس میں کسی بھی قسم کا ہُنر ہو
مجھے احسن کی بات پر تعجب ہوا

ہُنر کسی بھی قسم کا ہوسکتا ہے؟

احسن نے پھر سے مجھے پوچھنے پر مجبور کر دیا

کہ فنکار کی کوئی تو مثال ہوگی؟

کہا جو اپنی قابلیت سے کوئی کام کرے

جس سے لوگوں کو اسکا کام سب سے الگ لگے

جس کے کام کا کوئی ثانی نہ ہو

وہ فنکار ہے

یعنی ہمارے سیاستدان فنکار ہیں؟

22۔ ٹک ٹاک

جناب ہم سوشل میڈیا استعمال کرتے ہیں

جی میاں کرتے ہیں

ہم کھانے کی ٹیبل پر تھے

کونسی ایپلیکیشن کس لیے استعمال ہوتی؟

میں نے اکبر سے پوچھا

وٹس ایپ، فیس بک میں ہم من چاہے بندوں سے بات

اور اپنی صلاحیتوں کو منوا سکتے ہیں

انسٹاگرام اور ٹویٹر بڑے لوگوں کا کام ہے

اور کچھ کاروباری

اور بھی ہونگی؟

ہاں بہت ہیں

سنیپ چیٹ کا تو بھول گیا
میں اکبر کو روکتے ہوئے بولا
سوشل میڈیا میں بے حیائی بھی عام ہے
اور بڑھتی جا رہی ہے
اکبر فوراً بولا
کہیں آپکا اشارہ ٹک ٹاک کی طرف تو نہیں؟

23۔ بے ادبی

ایک کچڑے کے ڈھیر کو دیکھا
اسکے پاس کی دیوار پر لکھا تھا
یہاں پر کوڑا پھینکنا منع ہے
عبداللہ اور میں محو گفتگو تھے
پھر ایک جگہ گیا وہاں بہت بڑا اشتہار لگا تھا
اس پر کیا درج تھا عبداللہ فوراً بولا
یہاں اشتہار لگانا منع ہے
میں نے جواب دیا
پھر تھورا آگے گیا
محلے کے حاجی صاحب دیواروں پر فلیکس لگوا رہے تھے
اس پر کیا درج تھا
عبداللہ تجسس کے ساتھ بولا
براہ مہربانی محافل کے فلیکس نہ بنوائیں

سرکار دو عالم ﷺ کے نام والے فلیکس گرتے
تو بے ادبی ہوتی ہے
منجانب: حاجی محمد اللہ رکھا

24۔ ادبی نشست

ایک موصوفہ انگلینڈ سے ادبی نشستوں کے لئے تشریف لائیں
ایک ادبی نشست میں موصوفہ کو بلا کر کچھ بھی پیش کرنے کا کہا
کیونکہ وہ باہر سے آئی تھیں وہاں مجھے بھی مشاعرے کے لئے مدعو کیا گیا تھا
محترمہ نے مزاح نگاری کرنے کی کوشش کے بعد بتایا یہ مشتخا قفی صاحب کا ہے
ہم سب پریشان تھے ان کے صفحے پر جھانکا تو مشتاق احمد یوسفی لکھا تھا
پھر جون ایلیا کی غزل کے ساتھ زیادتی ہوئی کہا گیا یہ جون جولائی صاحب کی ہے
میں نے انکو کہا اب میری باری ہے رک جائیں میرا نام اگست ستمبر ہے

25۔ نوکری

نوید کو نوکری نہ ملتی تھی
وہ روز صبح اُٹھتا نماز پڑھتا دعا کرتا
اور نوکری کی تلاش میں نکل پڑتا
وہ ایسا ہر روز کرتا تھا؟
علی نے مجھ سے پوچھا
جی علی
اچھا پھر کیا ہوا؟
گھر لوٹ کر بھی نماز کے بعد دعا کرتا

یہ تو اچھی بات ہے نہ میاں

علی نے مجھ سے کہا

جی علی مگر ایسا زیادہ دیر نہ چل سکا

کیوں؟

اللہ نے نوید کی سن لی تھی اسے نوکری مل گئی

ارے واہ علی اچانک بولا اور مسکرایا

مگر علی اب صبح اُٹھتا ہے اور صرف نوکری کو جاتا ہے

26۔ جذبہ

تین لڑکے اپنی اپنی بائیک پر

معصوم شکلیں بنائے جا رہے تھے

آریان ان کو دیکھو

جی میاں دیکھ رہا ہوں ہمارے ملک کا مستقبل جا رہا ہے

وہ تو ٹھیک ہے مگر انکا داخلہ یقیناً نیا معلوم ہوتا ہے

میاں تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو

کیا تم انکے نئے کپڑے دیکھ کر ایسا کہہ رہے ہو؟

آریان قہقہہ لگا کر بولا

نہیں آریان

میں نے آریان کی طرف مسکرا کر جواب دیا

پھر انکے بستے نئے ہیں اس لیے؟

نہیں آریان

تو کیا اسے کسی قسم کا اندازہ کہہ سکتے ہیں؟

نہیں آریان اِن کا جذبہ نیا ہے

27۔ گناہ

عمیر بڑا عجیب انسان ہے

علی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا

عجیب؟ مگر کیسے؟

میں نے علی سے دریافت کرنا چاہا

وہ بیمار ہے اور پرہیز کرنے کا مشورہ ملا ہے اسے

مگر سارا دن بد پرہیزی کرتا ہے

اور دوا کے وقت اللہ سے دعا مانگتا ہے

یا اللہ ٹھیک کر دے

میرے دماغ کی گھنٹی زور سے بجی

اور کہا کہ ہم سب بھی تو بیمار ہیں

میاں ہم سب بیماری میں مبتلا ہیں وہ کیسے؟

عمیر بد پرہیزی کر کے اللہ سے رجوع کرتا ہے

اور ہم؟

علی فوراً بولا

اور ہم گناہ کر کے کرتے۔

28۔ عادتیں

بچپن میں پڑ جانے والی عادتوں کا بتاتا ہوں

جی میاں کیوں نہیں

حماد بولا

محلے میں ایک امیر گھر کا بچہ تھا

وہ جو کام کرتا محلے کے بچے وہی شروع کر دیتے.

ایسا ہے کیا؟

ہاں حماد اس بچے نے کنچے کھیلنا شروع کیے

سب نے وہی شروع کر دیے

پھر کرکٹ شروع ہوگئی

پھر گھروں میں ویڈیو گیمز کا رونا رونے جانے لگا

اس بچے نے گانا شروع کیا

سب نے بھی خود کو آزمایا

ارے واہ وہ بچہ تو استاد نکلا

ہاں حماد مگر

مگر کیا؟

حماد بولا

کاش وہ بچہ نمازیں بھی شروع کرتا۔

29۔ پُجاری

(لفظی کہانی)

مرجائے اب انسان

مرجائے؟

جی ہاں

وہ انسان جو پُجاری ہوتا ہے۔

پُجاری؟

جی ہاں ہوس کا پُجاری۔

30۔ ڈرگز

نوید بھی کم عقل ہے

کیوں میاں؟

قاسم بولا

قاسم وہ جذباتی ہے

کوئی بھی کام سوچ سمجھ کر نہیں کرتا

اب کیا کر دیا اس نے؟

قاسم نے مجھ سے پوچھا

کرنا کیا تھا پچھلے ہفتے ہم ہسپتال موجود تھے

وہاں بیٹھے بیٹھے جناب نے پولیس کو کال کر دی

اللہ اللہ کیوں؟

قاسم حیران ہوا

قاسم اس نے پولیس کو آ گاہ کیا کہ یہاں ڈرگز بیچے جاتے ہیں

اور پولیس کے ساتھ ساتھ میڈیا بھی وہاں آ گیا

واہ واہ یہ تو اچھی بات ہے

قاسم پھر سے بولا
خاک اچھی بات وہاں لکھا ہوا تھا
"فری ڈرگز کیمپ"

31۔ لاک ڈاؤن

رات دادا جان خواب میں آئے
بتایا فرشتہ، زینب اور بہت سی بچیاں
حیرانگی سے شکر ادا کر رہی تھیں
کہ اب کوئی بچی نہیں آئی
پھر کچھ پرندے کہنے لگے
زمین پر سب سو گئے ہیں کیا؟
کوئی پرندہ شہید ہو کر اوپر نہیں آیا؟
ایسے رش لگتا رہا سب حیران ہوتے رہے۔
میں نے دادا جان سے کہا آپ حیران نہیں ہوئے؟
کہنے لگے میں نصیحت کرنے آیا ہوں۔
کہ تم لوگ ایسے ہی گھروں میں رہو۔
اللہ کی جنت چھوٹی نہیں ہے۔
مگر اللہ کی مخلوق کو کچھ کرتے ہو
تو عرش تا فرش لرزش ہوتی ہے۔

☆☆☆

مقصدِ تخلیقِ انسانیت کا سفر

سوچ کا سفر سچ کا سفر ہے اور سچ کا سفر بڑا تلخ، دشوار، طویل اور پر خطر ہوا کرتا ہے. جس عمر میں نوجوان لفظ سوچ اور سفر کے حقیقی معانی سے بھی آشنا نہیں ہوتے حذیفہ اس عمر میں سوچ کے سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔

یہ سفر بڑا کٹھن بہت مشکل اور مصائب سے بھرا پڑا ہے مگر سچ کا متلاشی جب اپنے اردگرد ماحول میں لاتعداد قصے کہانیاں واقعات بکھرے دیکھتا ہے تو اس کے قدم اس سفر پر جا نکلتے ہیں جہاں راستے میں کوئی سایہ کوئی سائباں نہیں ہے یہ سفر دھوپ کی تمازت اور اندھی راہ کا سفر ہے مگر اجالے روشنی اور نور کی ڈگر پر چلنے والے یہ کب سوچتے ہیں کہ سامنے دھوپ کی چادر تنی ہے یا آفات کا آسمان پر پھیلائے کسی گہری اور مہیب سوچ میں غرق ہے . یہ مقابلہ دو ایسی سوچوں کا ہے جن میں ازل سے معرکہ حق و باطل جاری ہے. اس سفر کی تھکان بہت سوں کو روند کر خاک میں ملا کر دھول مٹی کر دیا کرتی ہے مگر جن کے ارادے پختہ ہوں جن کا نظریہ واضح ہو وہ نا دھوپ سے ڈرتے ہیں نا ابر انکو روک پاتے ہیں۔ زمانہ ان کو جتنے بھی تھپیڑے مارے وہ اس راہ میں دھوپ سہہ کر شجر سایہ دار اگاتے چلے جاتے ہیں۔ سوچ کا سفر گمان کے سفر سے بڑا سفر ہے کیونکہ گمان کا سفر پھول کلیوں، اور رنگ و بو کا سفر ہے مگر سوچ کا سفر تو دشت نوردی ہے۔ یہاں نا نغمہ و ساز ہے نا گل و گلزار کے افسانے۔

مگر صاحب کتاب سایوں سے الجھ کر اپنی ذات کا عرفان اپنے وجود کے ادراک اور اپنے ہونے کا یقین پانے میں رواں دواں ہے۔ اسے خبر ہے کہ اس دور میں سوچ اور سچ کے سفر کی قیمت کیا ہے مگر وہ سوچ کو قید نہیں کر پایا اس نے شکاریوں کو للکار کر اڑان بھر لی ہے اسکی جیت صرف اڑنا نہیں ہے بلکہ بادِ مخالف میں سفر کرنا بھی ہے. اس نے ہوا کے زور پر پنکھ پھیلانے کی جگہ ہوا کو چیر کر اپنے ارادوں کی جانب قصد سفر کیا ہے. اس کے راستے میں نا کہیں

کہکشاں ہے نا کوئی جگنو،لیکن اسے یقین محکم ہے وہ سیاہ رات کا فولادی سینہ پھاڑ کر اس سے اجلی صبح کشید لے گا۔

وہ جانتا ہے اسے کہاں کہاں سے گزر جانا ہے کہاں دیپ جلانے ہیں کہاں لہو بہانا ہے کہاں پر آخر معراج پانا ہے . مجھے یقین وامید واثق ہے اس مسافر کی منزل اب دور نہیں اور یہ سفر جو حق و سچ کا سفر ہے جو مقصد تخلیق انسان کا سفر ہے جو سوچ کا سفر ہے جو لفظ اور معانی کی تلاش کا سفر ہے جو گھٹا ٹوپ اندھیرے سے روشنیوں کا سفر ہے یہ سفر کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔

تبصرہ نگار: مرزا صہیب اکرام

☆☆☆

سفر آگہی

پہلی بات کتاب کا نام بہت خوبصورت ہے پڑھنے والے کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔دوسرا قاری کو خریدنے پر اُکساتا ہے کہ آخر سوچ کا سفر کیا ہے۔ یہاں سے آپ کا اور قاری کا دوستی کا رشتہ شروع ہوگا۔اس کتاب میں شامل جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے وہ بہت سوچ کر رکھے گئے ہیں جو لکھاری کے ذہن کی عکاسی کرتے نظر آئیں گے یہاں سوچ کا سفر قاری کے ساتھ اپنا سفر طے کرئے گا اور قاری اور لکھاری دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس کتاب کے آخری صفحے تک کا سفر کریں گے ۔یہ صرف ایک کتاب نہیں ہوگی بلکہ لکھاری کی ذہنی استعداد کا امتحان بھی ہے جو میرا خیال ہے آپ کامیابی سے کامرانی کا سفر جاری رکھیں گے۔موضوعات کا انتخاب بہت اعلی ہے۔۔۔کامیابی آپ کے قدم چومے۔۔۔۔

ناہید اقرار

ریڈیو پاکستان لاہور

☆☆☆

نئی جہت کا سفر

الحمداللہ مجھے یہ عبارت لکھنے میں انتہائی مسرت اور خوشی محسوس ہورہی ہے۔کہ میرے بھتیجے حذیفہ اشرف نے کتاب "سوچ کا سفر" لکھ کر ایک نئے سفر کو نئی سوچ دی ہے۔حذیفہ اشرف ماشااللہ میرے لئے نہایت محبت اور شفقت سے بھر پور خونی رشتے سے منسلک ہے۔

ان کی منفرد سوچ کے مضامین اور شاعری نئی نسل کے لئے چراغِ روشنی اور ایک نئی جہت کی طرف سفر ہے۔

حذیفہ کی کتاب سوچ کا سفر اِنسانی خلوص،محبت سے سرشار اور عقیدت کے سچے رشتوں پر مبنی ایک مسلسل سفر ہے۔جس کی منزل ایک اچھی سوچ ہی ہوسکتی ہے۔میں دعا گو ہوں حذیفہ اشرف کو اللہ ترقی کی منازل کی طرف گامزن کرے،ملک وقوم کا یہ سرمایہ وطنِ عزیز کے لئے نام روشن کرے آمین۔

دعا گو

صاحبزادہ میاں محمد اکرم

سینئر مینجر HSE

اظہار گروپ آف کمپنیز لاہور۔

☆☆☆

مجموعہ فکر و محبت

نوجوان لکھاری شاعر صاحبزادہ حذیفہ اشرف عاصمی نے اپنی پہلی کتاب سوچ کا سفر لکھ کر نوجوان نسل کو بے پناہ حوصلہ دیا ہے۔ مادیت کے دور میں جب ہر طرف سوشل میڈیا نے سنسنی اور بے چینی پیدا کر رکھی ہے ایسے میں امید کے چراغ جلائے حذیفہ سب کو دعوتِ فکرِ دنیا دکھائی دیتا ہے کہ کسی صورت بھی مایوس نہیں ہونا اور ہر طرح کے حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرنا ہے۔ حذیفہ اشرف عاصمی جھوٹ، تصنع، بناوٹ سے نفرت اور انسان دوستی کا علمبردار ہے حذیفہ اشرف کی تحریروں اور شاعری میں دُکھ کے ساتھ سُکھ کی نوید بھی ہے اور ظلم کے خلاف ڈٹ جانے کا مقام بھی ہے . حذیفہ کی پہلی کاوش صرف الفاظ و واقعات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک نوجوان کی جستجو لگن محنت فکر، نظریات اور سوچ کا اظہار ہے۔ اس لئے اس کتاب کے اندر ہر قاری محبت عقیدت اصول امید یقین کی دولت پا سکتا ہے بس دل کشادہ اور سوچ وسیع ہونی چاہیے۔

مجھے خوشی ہے کہ میرے نواسے صاحبزادہ حذیفہ اشرف عاصمی نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے حق کے لئے قلم اُٹھا رکھا ہے حذیفہ جیسے نوجوان ہمارے معاشرے کا وہ روشن چہرہ ہیں جن پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے . آئیں ہم مل کر ادب کی دنیا کے اس نئے لیکن ہونہار انسان کا کھلے دل سے استقبال کریں تاکہ اس کا یہ سفر کبھی ختم نا ہو بلکہ یہ ہمیشہ سچ حق حقیقت اور امید کی تلاش میں سرگرداں رہے۔

جگر گوشہ حضرت پیر میاں محمد عنایت خان قادری نوشاہی رحمتہ اللہ علیہ

حضرت صاحبزادہ پیر میاں محمد یوسف قادری نوشاہی۔

★★★

شمع لے کر چل نکلا ہے

سوچ کا سفر ایک ایسا سفر ہے جسکو طے کرنے کے لیئے حذیفہ نے صرف خود کو ہی اس سفر کا مسافر نہ بنایا بلکہ نوجوان نسل میں امید کے چراغ روشن کرنے کے لیے ان کو بھی اس نے اپنا ہم سفر بنایا ہے۔حذیفہ کی یہ کتاب اس کی اس سوچ کی عکاسی کرتی ہے جو اس نے سیکھنے کے عمل سے لے کر سیکھانے تک اس پر کام کیا اور کامیابی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اس کی سوچ ہمیں مثبت راہ دکھاتی ہے جہاں لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہیں، جہاں لوگوں کے پاس دوسروں کی پرواہ کرنے سے فرصت نہیں ملتی، جہاں لوگوں کو سارا معاشرہ ہی زہر آلود نظر آتا ہے، جہاں لوگوں کی سوچ محدود ہو کر رہ گئی ہے،اسی دور میں حذیفہ نے ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے، حذیفہ کی یہ کتاب جدید دور کے مطابق ان لوگوں کے لئے مشعل راہ ہے جو تاریکیوں میں کہیں کھو گئے ہیں جنہیں کوئی راہ نظر نہیں آتا، جو ایسے حالات سے دو چار ہو جاتے ہیں،جنہیں مسائل کا حل نہیں ملتا،جنہیں خود میں موجود خوبیوں کا علم نہیں ،جنہیں خود پر اعتماد نہیں یا جن میں احساس ختم ہو چکا ہو جنہیں حق بات نہ کہنا آتی ہو جنہیں نفرتوں کو محبتوں میں بدلنا نہ آتا ہو جنہیں معاشرے کے حالات کا جائزہ نہ لینا آتا ہو۔حذیفہ کی اس کتاب میں نہ صرف مثبت پہلوؤں کی بات کی گئی ہے بلکہ کچھ معاشرتی حقیقتوں سے بھی پردہ اُٹھایا گیا۔میں حذیفہ کا بڑا بھائی ہونے کے ناطے حذیفہ کو اس کی سرگرمیوں میں بھرپور سراہتا رہتا ہوں کیونکہ اسکے اس مقصد میں یہ اکیلا نہیں ہے ہم سب اسکے ساتھ ہیں۔

بات شاعری کی ہو،تقاریر کی ہو،سولفظی کہانیوں کی ہو،کالم نویسی کی ہو، یا افسانہ نگاری کی اس کو اپنی بات کو بخوبی اور منفرد انداز میں پیش کرنا آتا ہے اور میرے خیال سے اپنی بات

دوسروں تک پہنچا دینا ہی بہت بڑی کامیابی ہے۔اورتو اور حضور سرورِکونینﷺ کی ثنا خوانی بھی بھرپور کیا کرتا ہے۔ جواسکی کامیابیوں کی بہت بڑی وجہ ہے۔

اس کا پنپتا ہوا شوق ہمارے خاندان کے بچے بچوں میں گھر کر چُکا ہے۔بچہ ہو یا بڑا اُسے کچھ الگ سوچنے پر مجبور کر دیا گیا ہےاور یہ اسکی کامیابی کی وہ سیڑھی ہے جس پر یہ بہت پہلے قدم رکھ چکا ہے۔میں اپنے پیارے بھائی صاحبزادہ حذیفہ اشرف عاصمی کواسکی پہلی کتاب کی اشاعت پر بہت مبارکباد دیتا ہوں۔ ایسے ہی آگے بڑھتے رہیں۔

پیرزادہ میاں محمد عمر اشرف عاصمی

ریسرچ اسکالر

ڈائریکٹر نوشاہی قران مرکز لاہور

مرکزی صدر تحفظِ ناموسِ رسالتﷺ موومنٹ انٹرنیشنل

☆☆☆

ادبی دنیا کے نئے مسافر

انسان کے تمام افعال و اعمال اس کی سوچ کے تابع ہوتے ہیں۔انسان اپنی سوچ اور فکر کے مطابق اپنے افعال انجام دیتا ہے۔اگر سوچ مثبت اور تعمیری ہوگی تو انسان معاشرے میں اچھے نیک کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے گا۔اور اگر انسان کے ذہن میں تخریبی سوچ جنم لے گی تو اسے برائی اور بداعمالی کے سوا کچھ اور نہیں سوجھے گا۔گویا انسان کی سوچ اور فکر ہی اس کے افعال و اعمال اور اس کے کردار میں ڈھل کر معاشرے میں مثبت یا منفی تبدیلی لاتی ہے۔معاشرہ افراد سے تشکیل پاتا ہے جب لوگ اچھی سوچ کے حامل ہونگے تب ایک عمدہ اور مثالی معاشرہ معرضِ وجود میں آئے گا۔یہی سوچ کر حذیفہ اشرف عاصمی نے "سوچ کا سفر" شروع کیا۔ اگرچہ یہ سفر دشوار گزرا اور مصائب و آلام سے بھرپور ہے تاہم حذیفہ اشرف ایک بلند ہمت اور پُرعزم نوجوان ہیں وہ بے خوف وخطر سوچ کے سفر پر روانہ ہو چکے ہیں میری دعائیں اور نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں۔

دنیا میں کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں قدرت نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا ہوتا ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر زندگی کے مختلف شعبوں میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر کے بہت جلد نمایاں مقام حاصل کر لیتے ہیں۔حذیفہ اشرف عاصمی کا شمار بھی انہی باصلاحیت لوگوں میں ہوتا ہے۔حذیفہ اشرف ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں۔وہ شاعری کالم نگاری، مضمون نویسی، خطابت اور نعت خوانی کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ پہلے پہل میں حذیفہ کی پرسوز، سحر انگیز اور عقیدت بھری آواز کا مداح تھا جس سے وہ آقائے دو جہاں ﷺ کی ثناء خوانی کرتے ہیں لیکن اب میں ان کی شوخئ تحریر کا بھی پرستار بن گیا ہوں۔

حذیفہ اشرف نے اپنے ادبی سفر کی باقاعدہ ابتداء کر دی ہے۔اور اس ابتدا کا نام "سوچ کا سفر" جس کے لئے میں انہیں صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"سوچ کا سفر" ان کی خوبصورت کہانیوں اور علمی و ادبی مضامین کا خوبصورت گلدستہ ہے جس کے مطالعے کے بعد کم عمر مصنف کو ان کی بالغ نظری پختہ خیالی کی داد دینی پڑتی ہے۔وہ اگرچہ ادبی دنیا کے نئے مسافر ہیں لیکن ایسے لگتا ہے کہ وہ مدتوں سے اس حسین دنیا کے راستوں سے بخوبی واقف ہیں۔

علی احمد کیانی

ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

شاعر و ادیب، کالم نگار

وائس چیئرمین نفاذ اُردو کمیٹی لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن

☆☆☆

نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ

حذیفہ سے میرا پہلا باقاعدہ تعارف ایک نعت خواں کے طور پر ہوا. اسکے علاوہ بھی انکی مختلف سرگرمیاں میری نظر سے گزریں . ہماری بات چیت کا آغاز ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا تاہم اس تمام عرصہ میں، میں نے انکو نہایت خوش اخلاق، خوش گفتار، سلیقہ مند، مہذب اور نیک اطوار کا حامل سلجھا ہوا انسان پایا۔

حذیفہ اور مجھ میں جو چیز مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ہم دونوں ہی نے اپنے بچپن کے کچھ قیمتی لمحات نظریہ پاکستان ٹرسٹ میں گزارے ہیں . میری ہی طرح آج حذیفہ بھی فکری طور پر سچے اور کھرے پاکستانی ہیں.

نعت پڑھنا ہو، کالم نگاری ہو یا شعر کہنا ہو جناب ان سب میں کسی سے پیچھے نہیں بلکہ میں تو انکو ہرفن مولا کہا کرتی ہوں. اللہ پاک نے ان کو بہترین ذہن بھی دیا ہے اور ایسا قلم بھی جس سے یہ اپنے نظریات و خیالات کو دوسروں تک بہت اچھے انداز میں پہنچاتے ہیں۔

سچ کہوں تو سمجھ میں نہیں آتا انہیں کیا کہا جائے، شاعر، کالم نگار یا نعت خواں۔ اسی لئے میں تو اس قدر خوبیاں رکھنے والے انسان کو رائیٹر کہتی ہوں۔اللہ نے انکو لکھنے کی خداداد صلاحیتوں سے نوازا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ان کے گلے میں بھی جادو ہے۔ یہ اپنی خوبصورت آواز کو استعمال میں لاکر جب کوئی نعت پڑھتے ہیں یا شعر کہتے ہیں تو سماں بندھ جاتا ہے. انکا اندازِ بیان اس قدر دل موہ لینے والا ہے کہ سبھی عش عش کر اٹھتے ہیں۔

شروع شروع میں جب میں نے حذیفہ کے چند مضامین پڑھے اور کچھ شعر بھی نظر سے گزرے تو دنگ رہ گئی اور یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ کوئی کم عمر بچہ اتنا پختہ لکھ سکتا ہے۔

حذیفہ اس عمر میں جس طرح کالم میں تمام جزیات بیان کرتے ہیں وہ نہایت قابلِ تعریف ہے۔ کالم لکھنا اور اچھا کالم لکھنا اس عمر میں آسان نہیں ہے مگر حذیفہ کو اس پر عبور حاصل ہے...

وہ مشکل موضوعات پر لکھنے سے نہیں گھبراتے بلکہ حیرت انگیز طور پر انکا قلم ان موضوعات پر کھرا اترتا ہے. اپنی تحریروں میں وہ ایک سچے پاکستانی کی طرح نوجوان نسل کو شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؒ کے بارے میں آگاہی دیتے ہیں تو وہیں انکا قلم پاکستان میں پھیلی دہشت گردی اور اے پی ایس کے معصوم بچوں کی شہادت پر خون کے آنسو روتا دیکھائی دیتا ہے۔

تاجدارِ کائنات پیارے نبی صلی اللہ علیہ وعلی وسلم کی شان میں بھی انکے قلم کا چلنا ایک سچا مسلمان ہونے کی گواہی ہے۔

زیرِ نظر کتاب "سوچ کا سفر" جو ہمارے سامنے ہے۔

مجھے اس کتاب کی خوشی بلکل ویسی ہی محسوس ہو رہی ہے جیسے یہ میری ہی کتاب ہو . دوستی تعلق اور اخلاص کے رشتے میں بندھے ہونے کی بنا پر انہوں نے بہن سے محبت آمیز اصرار کر کے مجھے یہ اعزاز اور عزت بخشی ہے کہ میں انکی پہلی کتاب پر تبصرہ کروں. میرے لیے یہ سب مسرتوں سے بھرپور ہے۔

کم عمر میں وسیع تجربات کو اپنے اندر سمونے والے حذیفہ کی کتاب "سوچ کا سفر" حقیقی طور پر سوچ کا سفر ہی ہے. یہ سوچ ہے اپنے وطن سے محبت کی, اپنی مٹی سے وفا کی, اپنے نوجوانوں میں امید قائم کرنے کی. یہ سوچ ہے انسان کے اندر سے منفی جذبات کو نکال کر ان کو مثبت ڈگر پر لانے کی. یہ سوچ ہے کہ کس طرح پاکستان عظیم سے عظیم تر بن سکتا ہے، یہ سوچ ہے ایسے بچے کی جس نے تھوڑی سی عمر میں طویل سفر طے کر لیا ہے. جس کا خواب امن ہے، خوشحالی ہے، مضبوط ملک اور توانا قوم ہے -

یہ صرف مصنف کی سوچ نہیں ہے بلکہ یہ تو آج ملک کے ہر ذی شعور انسان کے دل کی صدا ہے۔ لوگ سوچتے رہ جاتے ہیں, وقت کا انتظار کرتے رہ جاتے ہیں مگر حذیفہ نے اپنی سوچ اپنے جذبات و خیال اور نظریات کو سب کے سامنے کتابی شکل میں لا کھڑا کیا ہے۔

یہ کتاب اسکی سوچ کی مثبت عکاس ہے کہ انسان کامیابی کیسے حاصل کر سکتا ہے. اپنے

اندر جذبہ اور خود اعتمادی کیسے پیدا کی جا سکتی ہے. یہ کتاب ہر انسان کو وہ امید دلا سکتی ہے جس کے بعد وہ کامیابی کی جانب دوبارہ چل سکتا ہے۔

مجھ ناچیز کو ان سے ملنے کا بھی شرف حاصل ہو چکا ہے انکی قربت میں بیٹھ کر میں نے دیکھا کہ جناب نہ صرف اچھا لکھ لیتے ہیں بلکہ اچھا بول بھی لیتے ہیں اسکے ساتھ ہی اچھے سامعین بھی ہیں سامنے والا کیا کہہ رہا ہے دلچسپی سے سنتے ہیں کیونکہ انکے اندر سیکھنے کی، بات کو سمجھنے کی اور کچھ کر دیکھانے کی لگن موجود ہے،ہمیں اکثر ایک ساتھ ادبی تقریبات میں شرکت کرنے کا موقع ملتا ہے۔

آج کے دور میں جب ہمارے بچے اور نوجوان لکھنے پڑھنے سے بالکل دور ہو رہے ہیں اور بے راہ روی کا شکار ہیں بلکہ مایوسی کی جانب لمحہ بالمحہ بڑھ رہے ہیں ایسے میں حذیفہ جیسے نوجوان اس قحط الرجالی کے دور میں ہمارے لئے عظیم نعمت ہیں جو اب بھی نا صرف کتاب و ادب سے جڑے ہیں بلکہ اس میں اپنا حصہ بھی ڈال رہے ہیں۔

دعا گو ہوں اللہ پاک انکی اس پہلی کاوش کو خوب کامیابی و کامرانی دے اور یہ اس سفر میں ہمارے ساتھ جمے رہیں، اور ہمیں انکے قلم سے آئندہ بھی پڑھنے کو ملتا رہے آمین !!!

فلک زاہد

مصنفہ

☆☆☆

سوچ کا سفر محبت کا سفر

اکثر لوگوں سے سننے کو ملتا تھا کہ آج کل لوگ کتابیں خریدتے نہیں اور کم پڑھتے ہیں لیکن میں حیران ہوتا ہوں آج کے نوجوان لکھاریوں پر جو نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ قلمی جہاد بھی جاری رکھے ہوئے ہیں اور تو اور صاحب کتاب بھی ہیں صاحبزادہ حذیفہ اشرف کے بارے میں کسی ایک پہلو پر لکھنا ممکن نہیں لیکن چند خوائص پر روشنی ڈالے دیتا ہوں موصوف ایک بہترین نعت خواں ہیں کس قدر محبت کے ساتھ بارگاہِ اہل بیت میں ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہیں انکی ایک خوبی ہے جس کی بنیاد پر مجھے یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ بہت جلد محبتیں سمیٹتے ہوئے مقبولیت پالیں گے وہ ہے انکی عاجزی اور سینئرز کا احترام جب برادرم نوید اسلم کے ساتھ مل کر پی سی ایف کی بنیاد رکھی وہاں صاحبزادہ حذیفہ سے ملاقات ہوئی اور اسی ملاقات میں ہم صاحب سے شانِ اہل بیت میں عقیدت سے بھرپور کلام سُن کر (جو کہ انہی کا ہی لکھا ہوا تھا) ہم صاحب کے گرویدہ ہو گئے اور اس وقت سے لے کر اب تک یہ پی سی ایف کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ میں صاحبزادہ حذیفہ کی عقیدت کو دیکھتے ہوئے آج ایک بات کرنا چاہتا ہوں عزیز میاں قوال سے انکے بیٹے نے دریافت کیا کہ آپ جب پڑھتے ہیں تو ایسی کیا بات جو لوگ آپکو جوک در جوک سنتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھ میں کچھ نہیں یہ اہلِ بیتؑ سے عقیدت اور محبت کا صلہ ہے مجھے حذیفہ بھی عقیدت مند اور محبّ دکھتے ہیں اسی لیے شاید دوسروں کی نسبت زیادہ تاثیر رکھتے

ہیں۔یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے یہ میرے چھوٹے بھائی حذیفہ اشرف کی قلمی جہد ہے کیا خوبصورت کتاب ہے "سوچ کا سفر "جس میں حمد،نعت،منقبت بھی انہی کی لکھی ہوئی شامل ہیں اور سولفظی کہانیاں بھی کتاب میں جگہ بنائے ہوئے ہیں۔جس طرح کتاب کا نام خوبصورت ہے اسی طرح اس میں مواد بھی موٹیویشنل ہے میری دعا ہے ایسے دیپ سدا جلتے رہیں اور انہی روشنیوں سے میرا پیارا پاکستان جگمگاتا رہے اور اللہ پاک حذیفہ کو اور زورِ قلم عطا فرمائے آمین۔۔

یہ شعر حذیفہ کے لیے۔۔

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

شہزادروشن گیلانی

ماہرِ تعلقات عامہ

جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر

حضرت اقبالؒ روایتی شعراء سے ذرا ہٹ کر لکھنے والے شاعر تھے، ان کے اشعار میں ہمیشہ نوجوانوں کے لئے بیداری، خودی کو جاننے، کوشش کرنے، جستجو میں رہنے، تلاش کرنے، اپنے زمانے آپ بنانے جیسے بے پناہ پہلو تھے۔ وہ مسلمان نوجوانوں کو ہمیشہ شاہین سے تشبیہ دیتے تھے۔ وہ جب خالق کائنات سے دعا مانگتے تو عرض کرتے "جوانوں کو پیروں کا استاد کر" آج اگر اقبالؒ ہوتے تو وہ خدا بزرگ و برتر کے حضور پیش ہوتے اور شکر کرتے کہ اس کے نوجوانوں سے پیروں کے استادوں والا کام لیا جا رہا ہے۔ میں جب بھی کسی نوجوان کو دیکھتا ہوں تو ایک سوچ کا سفر شروع ہو جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں اللہ نے اس میں کون سی ایسی خوبی رکھی ہے جس کو جان کر یہ اقبالؒ کا شاہین بن سکتا ہے۔ یہ بھی سفر ہوتا ہے اور دوسرا سوچ کا سفر پیارے بھائی حذیفہ اشرف نے طے کر لیا ہے، اس نے اقبالؒ کے خودی کے فلسفے کو سمجھ لیا ہے، اور اب یہ اس جستجو میں ہے کہ یہ دوسروں کو بھی خودی تلاش کرنے، کوشش کرنے اور آگے بڑھنے کی طرف راغب کر سکے۔ یہ لڑکا اقبالؒ کا شاہین ہے، مجھے فخر ہے کہ میرے اقبالؒ کے شاہین مثبت سوچ بانٹ رہے ہیں، لوگوں کو امید دے رہے ہیں، اس کٹھن زدہ معاشرے میں جہاں ہر طرف دلدل اور بدبو ہے، یہ لڑکا امید کی کرن، کامیابی، موٹیویشن، آگے بڑھنے کی بات کر رہا ہے۔ یہ کانٹوں کے دیس میں گلاب لیے پھر رہا ہے اور خوشبوئیں پھیلانے کی رسم ادا کر رہا ہے۔ ایسے نوجوان ہی قوموں کی تقدیریں بدلنے میں اہم ترین کردار ثابت ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے ہاتھ میں موجود، حذیفہ اشرف کی تصنیف آپ کی زندگی کو ایک نئی امید، ایک نئی سوچ، ایک نئی کامیابی اور زندگی میں سوچ کے نئے سفر کا آغاز کرنے میں اہم گُر ثابت ہوگی۔ میری دعا ہے کہ یہ ہمیشہ کامیابیاں سمیٹے اور مسکراہٹ اس کی پہچان بن جائے۔ آمین

نوید اسلم ملک

صحافی، پی آر مینجر علم کی دنیا